



محمد نثار احمد لکھنؤی
گورنمنٹ کالج بنوں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حیاتِ اشرف

سوانح حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف

مولانا غلام محمد صاحب

مستر شد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

محمد عبد المنان غفک

مکتبہ تھانوی، دفتر الالبقاء

متصل مسافر خانہ - بند روڈ - کراچی

026781

جملہ حقوق بحق مکتبہ تھانوی محفوظ!

قیمت مجلد تین روپے بارہ آنے

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	باب چہارم		باب دوم	۵	پیش لفظ از حضرت مولانا
۱۳۹	مسک اشرفیہ	۱۱۱	آئینہ علمیہ		عبدالباری صاحب دوی نطلہ
۲۲۰	اعتدال	۱۱۲	جامعیت آثار	۸	تقریظ از حضرت مولانا
۲۲۳	مولانا تھانوی کی	۱۲۰	تجوید و قرأت و متعلقا		مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ
	اعتدال پسندی		قرآنی	۱۱	گزارش احوال واقعی
۲۵۲	تصوف و صوفیہ میں	۱۲۱	ترجمہ و تفسیر قرآن		از مولف
۲۶۸	سیاسی مسلک میں	۱۲۶	علوم القرآن		باب اول
۲۸۵	دعوت میں	۱۲۶	قرآن مجید کے ترتیب اور غیز		از طلوع تا غروب
۲۹۱	باب پنجم	۱۲۶	علوم الحدیث	۱۷	نسب اور خاندان
۲۹۲	معالجات اشرفیہ	۱۲۶	علوم الفقہ	۱۸	ولادت اور زچہ پن
۲۹۳	ضروری تمہید	۱۲۶	علم کلام	۲۲	حصول علم
۱۹۴	اختیار کانسخہ	۱۲۶	علم سلوک و تصوف	۲۹	طالب علمانہ حیثیت
"	پیشانیوں کا علاج	۱۵۳	اصلاحیات	۳۲	افادہ علمی
"	بد نظری کا علاج	۱۵۴	باب سویم	۳۸	اصول تعلیم
۲۹۵	مبتلائے شہوت لانی	۱۵۴	نقوش عملیہ	۴۶	اکابر عصر کی خدمت میں
	کا علاج	۱۹۴	خانقاہ کی حقیقت و اہمیت	۵۱	شیخ دریاں تعلق اور
"	غیبت کا علاج	۱۹۴	حلقہ امدادیہ	۵۹	حج بیت اللہ
۲۹۶	کبر کی حقیقت اور	۱۹۴	ضبط اوقات و تنظیل کار		حج ثانی اور صحبت شیخ
۲۹۷	اس کا علاج	۱۹۴	تواناں طبع	۶۳	والپسی اور قیام وطن
۲۹۷	غصہ کا علاج	۱۹۵	تبلیغ و اشاعت دین	۷۳	علاقت و رحلت
"	حسد اور غبطہ کا	۲۰۹	مریانیہ شان	۱۰۳	وصال شیخ
	فرق	۲۲۵	تربیت یافتگان اشرفیہ	۱۰۵	مرتبہ شہادت سے سرفرازی
		۲۳۱	کرامات	۱۰۹	

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۲۲	شیخ کی نظر ملکات پر ہونی چاہیے	۱۹۲	نجدیوں کے متعلق معتدل رائے	۲۹۷	اور حسد کا علاج کینہ اور طبعی انقباض کا فرق اور کینہ کا علاج
۲۲۹	ایک خبرت آموذہ واقعہ	۲۰۱	ادارہ دعوت الحق	۲۹۸	حب جاہ کا علمی و عملی علاج ریا کی حقیقت اور اس کا علاج
۲۳۱	کرامات کا درجہ	۲۱۰	ظاہر باطن دونوں پر شریعت حاکم ہے	۲۹۹	علاج کذب وسوسوں کا علاج
۲۵۲	سلاسل الربہ	۲۱۳	شیخ رہبر سے نہ کہ حبس کا ٹھیکیدار	۳۰۰	حصول راحت کا نسخہ کبیر پنج گنج اشرف تمت
۲۵۲	عام صوفیائے کرام اور خصوصاً	۲۱۵	بیعت کے اصول	۳۰۱	نہ وری متفرق عنوانات
۲۵۷	حضرات چشتیہ شیخ اکبر سے متعلق مسلک	۲۱۸	اجازت شیخ کا درجہ	۳۰۲	طریق اجتہاد و طریق انائیت وحدۃ الوجود
۲۵۹	امام ابن تیمیہ	۲۱۹	طالب کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں	۳۰۳	وحدۃ الشہود ذوق و شوق مقصود اصلی نہیں
۲۶۲	حسین ابن منصور حلاج	۲۲۰	نصف سلوک	۳۰۴	حال اور مقام ایک آخری روحانی طبیعی
۲۶۳	ایک عام اصول اور ایم انتقاد	۲۲۱	مجاہد کا درجہ اور زائد و راہب کا فرق	۳۰۵	ایک محسن کی یاد پر وداعی
۲۶۵	حجاءات اربعہ	۲۲۲	کیفیت و احوال کا درجہ	۳۰۶	اول تدم نفس ہے
۲۷۵	حمایت مسلم لیگ کے حدود	۲۲۳	اصل شے اتباع سنت و محبت شیخ سے	۳۰۷	ایک محسن کی یاد پر وداعی
۳۱۰	لیگ و کانگریس کی مثال	۳۱۰	اس طریق کا اول تدم نفس ہے	۳۰۸	ایک محسن کی یاد پر وداعی
۳۸۱	سومن کا نفرین	۳۸۱	نفس ہے	۳۸۱	ایک محسن کی یاد پر وداعی



Acc No:

★MAILS★

31

حضرت مولانا عید الباری صاحب ندوی مدظلہ سابقی پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

★

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خاتمة النبيين

تصنیف کا مطالعہ مصنف سے غائبانہ تلمذ و استفادہ ہوتا ہے اس استفادہ کا نفع بہت بڑھ جاتا ہے اگر خود مصنف کی صورت و سیرت و طبیعت سے کچھ حاضرانہ تعارف و تعلق رہا ہو۔ خصوصاً دین کے تجدیدی و اصلاحی مصنف کی روح تجدید و اصلاح کے فہم و قبول کے لئے تو اور کچھ اس کی شخصیت سے آگاہی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن کسی مصنف و مصلح سے یہ حاضرانہ واقفیت بھی اس کے تھوڑے بہت معاصرین ہی تک محدود رہتی ہے۔

نعم البدل نہیں لیکن ممکن بدل اس کا صاحب تصنیف کی محنت و
مستند سوانح حیات ہوتی ہے۔ الحمد للہ کہ وقت کے سب سے جامع مجدد و مصلح
مصنف حضرت مولائی و مولانا جامع المجددین حکیم الامتہ علیہ الرحمۃ کی
ایسی سوانح خود حضرت کی لفظ لفظ نظر فرمائی گئے بعد و بیابان خیر فی کے سب سے
زادہ حاضر باش آلہ خیر و نفعی حضرت خواجہ محمد امجد الحسن نور الشہر قدس



TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI

FEBRUARY

کے قلم سے تین مجلدات ہیں اشرف السوانح کے نام سے صاحب سوانح کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھی اور بعد وفات چوتھی جلد بنام خاتمتہ السوانح کی سعادت بھی "قلم عزیز" ہی کے حصے میں آئی۔

گو صاحب سوانح جیسی علم و عمل، ظاہر و باطن، عدل و حکمت، جمال و جلال کی جامع شخصیت کی کامل سراپا کشی کا تو حق ادا ہی کون کر سکتا ہے کہ "بسیار شیوہا ست بتاں را کہ نام نیست" پھر بھی جو لوگ حضرت کے نام اور کام سے برائے نام واقف یا سرے سے نا آشنا ہیں ان کی ابتدائی معرفت کے لئے ان مجلدات کی ایسی تلخیص درکار تھی جو چند گھنٹوں کے مطالعہ و فرصت ہی میں حضرت حکیم الامت کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کی ایک جھلک سامنے کر دے۔

حق تو یہ تھا کہ یہ مرقع حضرت سید القلم "ایجاز رقم" مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ العالی کے ہاتھ سے کھپتا، خصوصاً جدید تعلیم کے مختلف طبقات کی کشش کے لئے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ سعادت ممدوح محترم ہی کے ایک مترشد سعید اور خود تعلیم جدید ہی کے ایک فرزند عزیز مولوی غلام محمد صاحب بی۔ اے عثمانیہ کو عطا فرمانا تھا جنہاں اللہ جل جلالہ ماشاء اللہ تلخیص و اختصار کے اہتمام کے ساتھ کوئی خاص پہلو چھوڑا نہیں، نیز حضرت سید صاحب ممدوح کا ایک مستقل مضمون بھی ایسا شریک کر دیا گیا ہے جو حضرت "جامع المحمدین" کی تصنیفی و اصلاحی علمی جامعیت پر حضرت سید القلم "ایجاز رقم" کا اعجاز مجسم ہے۔ اور

یہ حیات اشرف بحمد اللہ اب ہر اعتبار سے ایسا بقامت کہتر بقیمیت بہتر
مجموعہ ہو گیا ہے جو بے تکلف اور بہ لچسپی بہت کھوڑی فرصت میں عصر
حاضر کی سب سے بڑی اور ہمہ گیر تجدیدی و اصلاحی شخصیت سے آشنا
کر سکتا ہے۔

حق تعالیٰ مؤلف سلمہ کی اس بروقت خدمت کو قبول و مقبول فرمائے
اور اس کے پڑھنے والوں کو خود صاحب سوانح کی اصلاحی و تصنیفی افادہ
سے مستفید ہونے کا شوق پیدا ہو کہ راقم احقر کی فہم و نظر میں دین ہی
ہمیں دنیا اور مسلمان ہی نہیں انسان بننے بنانے کی راہ تھی اس عہد
بے راہ روی میں اسی مصلح و مجدد وقت کی زبان و قلم کے واسطے سے کھولی گئی
ہے۔ وما ذا لك على الله لجنين؟

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب
بوئے گل را از کہ جویم جز گلاب

۱ حق العباد

عبدالباری غفرلہ

۱۶ رجب سنہ ۱۳۵۷ھ

تقریظ

۲۱

دنا ضلِ اجل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ العالی،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سیدی حضرت حکیم الامتؒ تھا لوی قدس سرہ کی سوانح حیات ہمارے
 بھائی خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے تین جلدوں میں اور پھر اس کا تکرار چوتھی
 جلد میں لکھا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ سوانح اشرفیہ کا بیان ان چار
 جلدوں میں بھی دریا بکوزہ ہی کا مصداق تھا۔ مگر عام طور پر لوگوں کے مشاغل
 اور قلتِ فرصت کے پیش نظر اس کی بھی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان
 چاروں جلدوں کی ایسی تلخیص بھی ہو جائے جو قلیل الوقت آدمی تھوڑے
 وقت میں دیکھ سکے اور اشرف السوانح کے اہم مضامین پر اجمالاً مطلع ہو سکے
 الحمد للہ کہ اس ضرورت کے لئے عزیز محترم مولوی غلام محمد صاحب جید رابادی
 نے قلم اٹھایا۔ کافی محنت اور تحقیق کے ساتھ یہ حیاتِ اشرف تصنیف فرمائی
 اس کے بہت سے مقامات متفرقہ کو احقر نے بھی دیکھا اور اپنے مشورے
 بھی مصنف سلمہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ میرے خیال میں یہ کتاب اپنے
 موضوع کیلئے کافی اور نہایت مفید ہے اللہ تعالیٰ مولف سلمہ کو جملے خیر

(بندرہ محمد شفیع کراچی)

عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۰ رمضان ۱۳۶۹ھ

طبع ثانی پر شکرِ مکرر

”حیات اشرف“ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں چھپی اور اہل نظر کی نگاہ میں اس نے شرف قبول پایا، کئی حضرات نے اس بات پر مبارک باد دی کہ اجمال و اختصار کے باوجود سوانح کا کوئی اہم پہلو چھوڑنے نہیں پایا بلکہ دیکھنے والوں نے اس میں جدید طرز کی بعض مفید اور ضروری باتوں کا اضافہ بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جو اصل سوانح میں موجود نہ تھیں، یہ سب کچھ عطاۃ الہی کا کرشمہ ہے۔

شکرِ نعمتہائے ’او‘ چند ائمہ لعتہائے ’او‘

جس ادارہ نے حیات اشرف چھاپی وہ ایک نوخیز اور ناجربہ کار ادارہ تھا، اس لئے جلد ہی ختم ہو گیا اور جب تک رہا نیم جان سا رہا، نتیجہ یہ کہ بازار میں کتاب کی طلب تھی اور کتاب ادارہ میں ذخیرہ محفوظ بنی ہوئی تھی، وہ تو ڈھونڈنے والوں کا کمال کہنے کے مخزن کا کھوج لگا لگا کر اس کے نسخے نکالتے رہے اور پڑھتے رہے! یہ بھی برسوں پہلے کی روئداد ہے،

چند روز ہوئے کہ باتوں باتوں میں محب گرامی قندرجناب عبدالمنان (مکتبہ تنہا لوی کراچی) نے حیات اشرف کے طبع ثانی کا ارادہ شوق و ذوق سے

ظاہر فرمایا، انکار کی وجہ نہ تھی، چنانچہ صحت کتابت اور حسن طباعت کی شرط کے ساتھ مایہ نوشی "کو سپرد" کرنے کا وعدہ کر لیا اور اب اس کا ایفہ کر رہا ہوں۔

موجودہ ایڈیشن میں بعض لفظی ترمیمات کے علاوہ جا بجا مختصر اضافے بھی ملیں گے، اور ایک نہایت مختصر و مفید مضمون حکیم الامت کی اعتدال پسندی سے متعلق حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اپنی مناسب جگہ شریک ملے گا۔ اس طرح یہ دوسرا ایڈیشن "نقش ثانی" ہی ثابت ہو گا، حیات اشرف پہلی بار چھپی تھی تو شیوخ طریقی اشرفیہ میں سے حضرت مرشدی سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب حضرت مولانا محمود الغنی صاحب رحمہم اللہ کی ہمت افزائیاں اور مبارکبادوں موافق عاجز کے شامل حال تھیں، مگر افسوس کہ آج شفقتِ کرم کا کل سراپہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

جو تھے دل کو پیارے وہ سب چل بسے

عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے !

دعا میری ہے اور آپ بھی آمین کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس تالیف کے نفع کو ان حضرات گرامی کے حق میں صدقہ جاریہ کا ذریعہ بنائے خصوصاً حضرت سیدی نور اللہ مرقدہ کی روح پر فتوح کو اس سے ناکندہ اندام و نشاط عطا فرمائے کہ میری ہر سعادت اندوڑی انہی کی ایک ایک نگاہ کا اثر معجز نما ہے، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ کاملۃ دائمۃ !

مورے مایہ غلام محجور۔ کراچی ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ اپریل ۱۹۶۳ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گزارش احوال واقعی

یادایام جب اس عاجز نے ایک نیم مذہبی ماحول کے اندر اس دارقانی
میں آنکھیں کھولیں۔ پھر اسلام کی حقیقت و افادیت سے نا آشنا لیکن ایک
پیدائشی پر و مذہب کی حیثیت سے عمر کی ابتدائی منزلیں طے کرتا رہا، اسکول
کی تعلیم رفتہ رفتہ اپنا رنگ جماتی چلی گئی۔ میٹرک کے درجہ میں پہنچ کر ایک
اپ لوڈیٹ لوجوان بن گیا۔ مذہب سے گریز بلکہ اس سے تمسخر میں مزہ آنے
لگا۔ ایف۔ اے کا آخری زمانہ تھا کہ کالوں نے مذہبی راگ ایک ایسے مغنی سے
سنی جو خود سمر پاز تھا۔ اس کے اثر سے قلب و دماغ بچ نہ سکا قائد ملت
نواب بہادر یار جنگ صدر مجلس اتحاد المسلمین (را علی اللہ مقامہ) کی ساحرانہ
تقریروں نے خود ان کی صحبت میں پہنچا دیا اور ان کی معیت نے "کلام اقبال
سے روشناس کرایا، اور اس کے اثر سے یہ عاصی ایک کٹر سیاسی مسلمان
بن گیا۔ لیکن پھر قائد ملت ہما کے درس ہائے تفسیر قرآن نے "حقیقت دین" تک
پہنچنے کی ایک تڑپ پیدا کر دی اور قلب و دماغ پر یہ جذبہ مسلط ہو گیا ایل۔ این۔

۱۔ سیاسی مسلمان سے میری مراد وہ ہے جس کی زبان پر اسلام کی رٹ ہو۔ باقی دل و دماغ بعض
وجوہ سبب مذہب فرسنگ رہیں۔

کا ابتدائی سال تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اس گنہگار پر کرم عظیم ہوا۔ ایک ہستی
 رونق بخش حیدر آباد ہوئی جس کی حیثیت اس وقت تک اپنے ذہن میں اڈیٹر
 معارف سے زیادہ نہ تھی، مجھ بے بصیرت کو پتہ نہ تھا کہ یہ عرفاً "مدیر معارف"
 لیکن حقیقتاً صاحب معارف ہیں۔ میں جانتا ہی نہ تھا کہ یہ "استاذ الکمل" ہیں۔
 "اسلام کی جوئے شیر کے فرماؤ" ہیں اور تھانہ بھون کے عارف کامل حضرت مولانا
 اشرف علی قدس سرہ سے بھی ان کو سند امتیاز حاصل ہے:

ان سلیمان گیر اخلاص عمل	دان تو ندوی رامزہ از غل
اے دلت معمور از اسرار حق	اے دلت مخمور از آثار حق
اے دلت پر نور از انوار حق	اے دلت مسرور از اخبار حق

ایک دوست کے کہنے پر پہلی مرتبہ اس "صاحب معارف" کی خدمت میں حاضری
 کا شرف ملا۔ اس روز کانوں نے جو کچھ سنا اور دل نے جو کچھ قبول کیا اس کا خلاصہ
 خود حضرت سیدی و مولائی علامہ صدیق سلیمان ندوی مدظلہ العالی کی زبان حقیقت
 ترجمان میں یہ تھا:

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے	وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دوروزہ کا کیا عیش و غم	سفر کا بھی کیا جیسے۔ تبیسے رہے
یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں	قلمِ دستِ کاتب ہیں جیسے رہے

کن الفاظ میں اس اثر کا اظہار کروں جو قلب پر ہو گیا۔

۱۔ دیکھو "اقبال نامہ" یعنی مکاتیب اقبالؒ تفصیل کیلئے دیکھو باب آثار علمیہ

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں اثر یہ ہونہیں سکتا کبھی دعوتے باطل میں

غرض حضرت سیدی مدظلہ العالی کے طفیل اس صحرا لورہ کو گلزارِ انشرفی (تصانیف و مواعظ اشرفیہ) کی سیرِ مسیبہ آئی اور یہ اسی عطرِ بزمِ فضا کا نتیجہ ہے کہ بحمد اللہ اب عمر کی تیسویں منزل پر پہنچ کر دماغِ اسلام کی صداقت کا قائل اور دل اس کی معنویت کا گھائل ہے۔ کوتاہی ہے تو عمل کی ہے، حق تعالیٰ اس کی کوپور فرمادیں کہ بازارِ آخرت میں نفع دینے والی یہی "جنسِ عمل" ہے۔

چونکہ اپنے اس انقلاب میں حضرت تھانویؒ قدس سرہ کے مواعظ و تصانیف کا بھی ایک خاص حصہ رہا ہے اور آج بھی وہ اصلاح و تقویتِ عمل کا موجب ہیں۔ اس لئے خیال ہوا کہ اور انگریزی داں اصحاب تک بھی یہ سلسلہ پہنچائی جائے جس کے نہ پہنچنے سے ہزاروں دل و دماغ کی کھینچا خشک و مردہ ہیں۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے محسوس کیا کہ صرف زبان کی قدامت کے باعث بہت سے اس فیض سے محروم ہیں ورنہ یہ دئے وہ نہیں جو ایک بار سنہ کو لگنے پر عمر بھر چھوٹ سکے۔ چنانچہ سیدی و مرشدی مدظلہ العالی کی اجازت سے حضرت اقدسؒ کے ایک وعظ الدنیا و الآخرۃ کی تسہیل کی جرت کی۔

الحمد للہ کہ اس کوشش نے "خاطرِ سلیمانی" میں اطمینان کا مقام پایا اب طباعت و اشاعت کے لئے مسودہ نامہ کے ہاں جا چکا تھا کہ حیدر آباد

دکن کی قسمت نے پلٹا کھایا اور آن کی آن میں وہ کچھ ہو گیا جو وہم و گمان سے باہر تھا
 عزت و عظمت، ذلت و نکبت سے بدل گئی اور جس دورِ حشمت پر اہل دکن نازاں
 تھے تہک الا یامرئلا و لہما بین الناس کے قانون نے اس فخر کو ان سے چھین لیا۔
 اس انقلاب نے ناشر کو خود را قلم کو کمر لپی آنے پر مجبور کر دیا، شکر ہے کہ وعظ کا
 مسودہ جو ایک ہی تھا ناشر کے ساتھ محفوظ رہا اب جب یہاں اس کی اشاعت کا
 وقت آیا تو جناب ناشر (مالک لفیس اکیڈمی) نے مشورۃ کہا کہ اس وعظ کے ساتھ
 اگر صاحب وعظ کی حیات بھی نو تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے آجائے تو زیادہ نفع
 کی امید ہے۔

مشورہ بہت نیک، لیکن کام ہمت کا طالب اور اہل رائے کی اجازت
 کا خواہاں تھا، حضرت سیدی مد فیوضہ تو عازم حج ہو چکے تھے، اتفاقاً ایک روز
 اس کا ذکر اپنے محترم صائب رائے دوست مولوی نور احمد صاحب اکیابی (خلیفہ)
 حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کے سامنے آیا، موصوف نے ہمت بندہائی
 بلکہ عجلت کا مشورہ دیا کہ ”بہشتی زیور کے ساتھ بھی اس کو شریک کیا جاسکے،
 لیکن پھر بھی کھٹک باقی تھی، آخر اپنے خیال اور دوست محترم کی تائید کو حضرت
 مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کی خدمت میں پیش کیا اور جب یہاں سے بھی ہمت
 افزائی ہوئی تو تو کلاً علی السہ کام شروع کر دیا، ارادہ تو یہ تھا کہ ۱۶۰ صفحوں
 میں اس کو تمام کیا جائے۔ تاکہ مقدمہ کے طور پر شریک رہے۔ لیکن جب
 لکھنے لگا تو تائید غیبی اور وسعت مضامین کے تقاضے سے یہ ایک مستقل

تالیف ہو گئی۔

حضرت حکیم الامتؒ کی سوانح حضرت کے ایک خلیفہ خاص خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب (بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی علیگ، حضرت ہی کی جیٹا میں بعنوان "اشرف السوانح" بڑی سائز کے (۸۶۸ صفحات میں تحریر فرما چکے تھے، اور پھر حضرت شیخ کے وصال پر اس کا تتمہ (۱۴۱) صفحات میں ختم فرمایا تھا، اس قدر ضخیم ذخیرہ کو اپنے انداز میں چھوٹی سائز کے ڈھائی تین سو صفحات میں لے آنا بڑا ہی ہمت شکن کام تھا لیکن بحمد اللہ جیسا کچھ ہو سکا ہدیہ ناظرین ہے۔

حکیم الامتؒ کی اس مختصر سوانح کے بیشتر اجزاء تو "اشرف السوانح" ہی سے ماخوذ ہیں۔ البتہ آقا دہلوی کا پورا باب حضرت سیدی و مرشدی دامت برکاتہم کے مضمون "حکیم الامت کے آثار علمیہ" کی نقل ہے۔ اور اس تالیف کی گویا جان ہے اور امتیاز بھی، "مسلك اشرفیہ" کے باب میں پروفیسر مولانا عبدالباری صاحب مدظلہ کی کتاب "تجدید و سلوک" سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ خود حضرت صاحب سوانح قدس سرہ کے مواعظ اور آپ کی تصانیف بھی مشن نظر رہی ہیں۔ پھر اس ساری احتیاط کے باوجود اس کو مفتی صاحب مدظلہ کی نگاہ تنقید سے گزرا گیا ہے اور حضرت سیدی و سندھی دامت فیوضہم نے بھی اس کو شرف نظر بخشا ہے۔

اس تالیف کی طباعت و اشاعت میں اپنی کوشش کے باوجود کافی تاخیر ہو گئی۔ لیکن اس کی مصلحت اب یوں ظاہر ہوئی کہ وہم و گمان کے

خلاف حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ یہاں تشریف لائے،
موصوف نے کتاب کا مسودہ حرف بحرف پڑھا اور اس پر ایک پیش لفظ
لکھ کر ممنون فرمایا۔

چند برس پہلے جب "قائد ملت" سوانح بہادر یار جنگ مرحوم کی
تالیف ہو سکی تھی تو یقین نہ آتا تھا کہ اس کو مقبولیت کا شرف بھی ملے گا، لیکن
آج جب کہ اپنا یہ گمان غلط ثابت ہو چکا ہے تو اب حق تعالیٰ کے اس برگزیدہ
بندہ "مجدد ملت" حکیم الامت "قدس سرہ کے سوانح حیات کو پیش کرتے
وقت دل اس ذرہ نواز کے لطف و کرم سے پُر امید ہے کہ
حی تو اند کہ دہدا شک مرا حسن قبول
آنکہ در ساختہ است قطرہ بارانی را

نقط

امیدوار رحمت

غلام محمد عفی عنہ

۱۸ رجب ۱۳۷۶ھ

مطابق ۲۵ اپریل ۱۹۵۶ء

بابِ أَوَّل

از طلوع تا غروب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَنَصِلًا

نسب اور خاندان

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ بھیم نے ضلع مظفرنگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے "تھانہ بھیم" بسایا تھا۔ پھر مسلمانوں کی آمد و سکونت پر اس کا نام "مچھرا پور" ہوا۔ مگر یہ نام مشہور نہ ہوا۔ اور وہی پرانا نام معروف رہا۔ البتہ "تھانہ بھیم" سے "تھانہ بھون" ہو گیا۔ یہ قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور چلا آ رہا ہے۔ اہل یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شو و قوت اور صاحب فضل و کمال رہتے ہیں۔

حکیم الامت مولانا النثر ف علی صاحب قدس سرہ کے اجداد نے آج سے صدیوں پہلے قصبہ تھانہ بھون میں طرح اقامت ڈالی تھی۔ دو صدیوں کے بعد اوتھانمیر ضلع کرنال سے نقل سکونت کر کے یہاں آئے تھے اور نسباً "فاروقی" تھے اور ننھیال کے اجداد جھنجھانہ سے تھانہ بھون منتقل ہوئے تھے اور علوی تھے حکیم الامت کے والد ماجد عبدالحق صاحب مرحوم ایک مقتدر رئیس صاحب نقد و جائداد اور کشادہ دست انسان تھے۔ میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے۔ اور باجارت رئیس کمسرپٹ کے ٹھیکے بھی لیا کرتے تھے،

فارسی میں اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ اور گو حافظ قرآن نہ تھے مگر ناظرہ بہت قوی تھا۔ اور قرآن مجید بہت صحت سے پڑھتے تھے۔ وہی اعتبار سے بڑے فریس تھے جس کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ اپنے صاحبزادوں کی استعداد و صلاحیت اور افتاد طبع کو بچپن ہی سے تاڑ گئے تھے اور اسی بنا پر حکیم الامت کو عربی و دنیاوی اور چھوٹے صاحبزادے اکبر علی مرحوم کو انگریزی و علوم دنیوی میں لگا رکھا تھا۔ اور اس تفریق تعلیم پر ان کو اس درجہ اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ جب ان کی بہاوج صاحبہ نے کہا: بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے۔ وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کا گزارہ کس طرح ہوگا؟ جائداد تو دو دین تقسیم ہو کر گزارے کے قابل نہ رہے گی۔ تو مرحوم پورے یقین کے ساتھ اور جوش سے کہہ اٹھے۔ بھابی صاحبہ! آپ کہتی ہیں کہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے؟ خدا کی قسم جس کو آپ کمانے والا سمجھتی ہیں اس جیسے اس کی جو تیوں سے لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی طرف رخ بھی نہ کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر علی مرحوم سے کہیں زیادہ حکیم الامت ہی پر روپیہ صرف کرتے تھے اور کہتے تھے مجھے اس پر حکیم الامت رحم آتا ہے، وہ جو کچھ مجھ سے لیتا ہے میری زندگی ہی تک ہے، میرے بعد یاد رکھو کہ وہ میرے مال و متاع سے بالکل علیحدہ رہے گا، کس بلا کی فراست ہے، اور مزاج شناسی باکرم مرحوم کچھ اور ہوتے تو ان کی یہی باتیں کرامات کہلاتیں۔ کیونکہ ان کا ہر قیاس آئندہ زندگی میں حقیقت بن کر

جلوہ نما ہوا۔

حکیم الامت کی والدہ ماجدہ بھی بڑی ذہین اور صاحب نسبت "بی بی" تھیں آپ کے ماموں پیر جی امداد علی صاحب ایک صاحب حال و قال بزرگ تھے۔ یہ اپنے وقت کے مجذوب کامل حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی کے مشورہ سے حیدر آباد کن تشریف لائے۔ یہاں ملازم بھی ہوئے اور بعد کو حضرت مجذوب ہی کے ایما سے مرزا سردار بیگ صاحب کی ارادت میں داخل ہوئے جنہوں نے نوابی و جاگیر داری کو ٹھکرا کر فقر و درویشی اختیار کر لی تھی۔ گو حکیم الامت کو مسائل و حقائق میں اپنے ماموں سے اختلاف تھا مگر ان کا جذبہ عشق بہر حال قابل قدر تھا، یہ ان کے عشق شعلہ باری کا اثر تھا کہ بقول حکیم الامت۔ ان کے اشعار سے آگ برستی تھی چنانچہ خود حضرت نے ان کا یہ شعر بارہا نقل کیا ہے۔

ساقی تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو نے یہ مئے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

آپ کے نانا میر نجابت علی صاحب اعلیٰ درجہ کے فارسی داں انشاء پر داں لطیفہ گو، بزرگہ سنچ اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی کے ایک خلیفہ خاص کے مرید تھے۔ اور حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

آپ کے جد اعلیٰ سلطان شہاب الدین علی فرخ شاہ کا بلی تھے۔

جن کی اولاد میں متغیر و علمائے حقانی اور صوفیائے ربانی ہوئے ہیں حضرت
 شیخ مجدد الف ثانی، شیخ جلال الدین تھانیسری، اور شیخ فرید الدین گنج شکر
 اسی سلسلہ ذہب کی چند کڑیاں ہیں۔ خود حضرت فرخ شاہ پہلے تو والی کابل
 رہے اور سلطنت غزنویہ کے زوال پر جذبہ جہاد کے ماتحت کئی بار ہندوستان
 پر حملہ کر کے کافروں کو زیر کیا اور بامراد لوٹے۔ پھر اس "جہاد اصغر" سے
 فارغ ہو کر "جہاد اکبر" میں مصروف ہو گئے۔ رہ جعنا من الجہاد الا صغرا
 اہی جہاد الا کبر۔ کابل کے کوہسار کو اپنا لشکر بنایا بزرگان چشت کے
 آگے زانوئے ارادت ہتھ کر کے مرتبہ کمال کو پہنچے۔ اور ایک عالم کو فیض یاب
 کیا اور پھر بعد وفات وہیں دفن ہوئے۔ یہ موضع آج تک "درہ فرخ شاہ"
 کے نام سے مشہور اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ولادت اور بحین

خاندان اشرف کی عظمت کا اندازہ ہو چکا، اب دیکھئے کہ ایسے عالیٰ خاندانہ میں جہاں دولت و حشمت اور زہد و تقویٰ بغاگیر ہوتے تھے حکیم الامت کی جامع شخصیت ظہور فرما ہوتی ہے۔

ولادت کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ آپ کے والد مرحوم کی اولاد نرینہ زندہ نہ رہتی تھی اس کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ موصوف کو جب مرض خارش نے آگھیرا اور کسی صورت سے دفع نہ ہوتا تھا تو مجبوراً کسی ڈاکٹر کے مشورہ سے ایسی دوا کھالی تھی جو دافع خارش مگر قاطع نسل بھی تھی۔ خارش تو جاتی رہی لیکن بظاہر بقائے نسل کے امکانات بھی دور ہو گئے۔ بات کب تک چھپی رہتی، خوش دامن صاحبہ کو اس کا پتہ لگا تو وہ سخت پریشان ہو گئیں۔ اور حافظ غلام تفسی صاحب پانی پی سے عرض کی۔ "میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے ہیں۔" حافظ صاحب کا معاملہ تو یہ تھا۔ ع

”قلندار ہرچہ گوید دید گوید“

فوراً مجذوبانہ انداز میں فرمایا۔ "غم و غلی کی کش کش میں مرتلتے ہیں۔ ابکی باری علی کے سپرد کر دینا۔" اس معجمہ کو کوئی پوچھ نہ سکا۔ لیکن حکیم الامت کی

والدہ کے ذہن رسالے اس کے راز کو پایا۔ وہ کہہ اٹھیں حافظ صاحب
 کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کی دوصیال ہے فاروقی اور ننھیال ہے علوی
 اور اب تک جو نام بھی رکھے گئے وہ دوصیالی طرز پر تھے، اب کی بار جب لڑکا
 ہو تو ننھیالی وزن پر نام رکھا جائے جس کے آخر میں علی ہو۔ حافظ صاحب
 یہ سنکر ہنس پڑے اور فرمایا: لڑکی بڑی ہشیار ہے میرا منشا یہی تھا۔
 پھر فرمایا اور بڑے جوش سے فرمایا: انشاء اللہ اس کے دولڑکے ہوں گے
 اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا اکبر علی۔
 ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔ دوسرا دنیا دار ہوگا۔ چنانچہ اس مرد
 و دلش نے جو کچھ تو کلام علی اللہ کہا تھا، حرف حرف پورا ہوا، اور کیوں نہ ہو
 گفتہ او گفتہ اللہ بود!

گرچہ از خلق م عبد اللہ بود

چنانچہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ کو چہار شنبہ کے دن صبح صادق کے ساتھ
 مجذوب کامل کی پیشین گوئی پیکر اشرف بنکر جلوہ نما ہوئی۔ خوش نصیب تھی
 وہ صبح جس کے پہلو سے یہ ہر درختاں نکل آیا۔

تاریخ پیدائش کرم عظیم "بھی کسی نے خوب نکالی ہے۔

ولادت کے چوڑھویں مہینے بعد حضرت حافظ کی دوسری پیشین گوئی بھی پوری
 ہوئی اور مولود کا نام اکبر علی رکھا گیا۔ چونکہ دو بچوں کے لئے ماں کا دودھ کافی
 نہ تھا اس لئے حکیم الامت کے لئے ایک انا رکھی گئی ابھی غم شریف نے شاید پانچ یا

منزلیں طے کی تھیں کہ مادی شفقت کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مگر شفقت پدری نے محبت مادی کا کام بھی انجام دیا چنانچہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی حفاظت و تربیت بڑے ہی پیارا اور محبت سوزی اور اسکا خاص خیال رکھا کہ غیرت و عزت نفس کے جو اہر پر گرد نہ آنے پائے۔ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر جب مٹھائی بٹتی تو اس میں اپنے فرزند کو ہرگز شریک نہ ہونے دیتے بلکہ خود بازار سے لاکر آپ کو جی بھر کھانا دیتے کہ دل میں طمع نہ رہے اور سمجھاتے کہ مسجد کی مٹھائی لینا بے غیرتی کی بات ہے۔ ادھر یہ رعایت و نرمی تھی دوسری طرف اس پر بھی پوری نگرانی تھی کہ کہیں لارڈ پیار سے بچہ میں گستاخی نہ بے ادبی پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ نو عمری میں ایک مرتبہ فرزند کی زبان سے مولانا رفیع الدین صاحب (مہتمم اول دارالعلوم دیوبند) کے متعلق یہ جملہ نکلا کہ مولانا تو پڑھے ہوئے نہیں ہیں، تو اس پر اس سختی سے ڈانٹا کہ گویا مارنا ہی باقی تھا۔ اور خوب جتنا یا کہ بزرگوں کی شان میں یوں نہیں کہا کرتے ہیں۔ غرض اس صحیح تربیت سے خداداد صلاحیتیں خوب ابھریں اور نکھر گئیں۔

خود طبیعت کا یہ حال تھا کہ بازاری لڑکوں کے ساتھ کھیل کود اور میل جول سے کبھی مناسبت نہ ہوتی اور اس کا باعث وہ دینی مذاق "تھا۔ جو فطرتاً آپ کے اندر موجود تھا۔ یہ نہیں کہ آپ کھیل کود جانتے ہی نہ تھے مگر آپ کا رنگ یہاں بھی نہ والا تھا۔ کھیلوں میں نماز باجماعت کی نقل اتارتے، بازار کی طرف نکل جاتے اور راستے میں مسجد نظر پڑتی تو سیدھے اندر چلے جاتے اور ممبر پرچہ کرکچھ پڑھ پڑھا کر لوٹ آتے۔ گویا مستقبل کا خاکہ اس نیم شادی

دور ہی سے کھینچ رہے تھے۔ آپ کے مزاج میں شوخی بھی تھی اور اس نے ذہانت سے مل کر عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی ایک ہی واقعہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک نابینا حافظ قرآن تھے اور ان کو کلام مجید خوب یاد تھا اور اس پر ان کو زائد بھی تھا۔ حکیم الامت کی نوعمری تھی ابھی ابھی حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تھے اور نابالغ ہونے کی وجہ سے نوافل میں قرآن پاک سنایا کرتے تھے، ایک دن حافظ جی سے فرمایا کہ آج آپ کو دھوکہ دوں گا اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ فلاں آیت میں ڈھوکا دوں گا، حافظ جی نے بر بنائے ناز کہا۔ جاؤ پھر تم کیا سمجھے دھوکہ دو گے بڑے بڑے حافظ نہ دے سکے بغرض جب آپ سناتے کھڑے ہوئے اور اس آیت پر پہنچے انما انت منذر لکل قوم یہاں تو بہت تڑپنے لگے ساتھ پڑھا جیسا کہ رکوع کرنے کے قریب پڑھا کرتے ہیں یا اس کے بعد جب اس سے آگے اللہ یعلم! الخ پڑھنے لگے تو لفظ "اللہ" کو اس طرح کھینچ کر پڑھا گویا اب رکوع کریں گے اور گویا "اللہ اکبر کہنے والے ہیں ایسے حافظ جی اس تصور سے فوراً رکوع میں چلے آدھراپ نے آگے قرات شروع کر دی یعلم ما تفعل الخ حافظ جی لاچار پھر گھڑے ہو گئے اور آپ بے قابو ہو کر زور سے ہنس پڑے اور نماز توڑ کر الگ ہو گئے اور جب خوب ہنس چکے تو دوبارہ نیت باندھ لی۔

اس شوخی کے ساتھ طبیعت کی سنجیدگی اور اس نوعمری میں اتنا بے خشتگی ملاحظہ ہوں ابھی ۱۲-۱۳ ہی برس کی عمر ہوگی کہ "فغان صبح کا ہی" کی لذت سے آشنا ہو گئے پچھلی رات سے اٹھ بیٹھتے۔ تنہا و ظائف میں محو ہو جاتے تھے ہمعصر و معیت کی یہ نیا زندگی کیا کچھ اثر نہ پیدا کر گئی ہوں گی۔ والدہ تو تھیں نہیں، اتنی صاحبہ

بچاری بہت بیتاب ہوتیں اور سمجھاتیں کہ اس نوعمری میں ان مشقتوں کی کیا حاجت ہے۔ لیکن جس کے مجمر قلب میں عشق کی آگ بھڑک چکی تھی وہ کیسے سمجھ سکتی تھی، خصوصاً جب کہ صحبت و شاکر دی تھی تو مولانا فتح محمد صاحب جیسے آتش بجان اور شعلہ سامان بزرگ کی! ع

ہر چہ گیر دعلتی علت شود!

حکیم الامت میں لطافت طبع اس درجہ کی تھی کہ بچپن کے تقریباً لاشعور دور میں بھی کسی برہنہ پیٹ دیکھ لیتے تو فوراً تھے ہو جاتی تھی، اس لطافت طبع کے باعث بہت ستائے گئے اور ہم عمروں نے بہت دق کیا۔ یہ تو بچپن تھا، بڑے ہو کر یہ حال تھا کہ جس کمرہ میں تیز خوشبو ہوتی تو سونہ سکتے تھے، کسی کا جھوٹا کھانا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ باوجود انتہائی عقیدت و محبت کے عمر بھر بھی اپنے بزرگوں کا جھوٹا نہیں کھایا۔ مزاج میں اصول پسندی اس درجہ کی تھی کہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں: آپ تو کسی بادشاہ کے ہاں پیدا ہوتے!

مولانا شیخ محمد صاحب تھا تو میاں محدث جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہاجر مکی کے پیر بھائی اور اپنے شیخ کے خلیفہ ارشد تھے۔ حکیم الامت کے بچپن ہی کے احوال و آثار سے آپ کے مستقبل کا اندازہ لگا چکے تھے اور فرماتے تھے: "میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔"

اسی لڑکپن کے زمانہ میں حکیم الامت نے ایک خواب دیکھا، جس کو ذہن نے پہلی بار محفوظ کیا، کہ بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے۔ اس میں دو خوبصورت

کبوتر ہیں، جب شام ہوئی اور تاریکی چھا گئی تو ان کبوتروں نے آپ سے کہا: "ہمارے
پنجرہ میں روشنی کر دو۔" آپ نے جواب دیا: "خود ہی کر لو۔" چنانچہ انہوں نے اپنی
چونچیں رگڑیں جس سے ایک تیز روشنی ہوئی اور سارا پنجرہ منور ہو گیا۔

ایک مدت بعد جب آپ نے یہ خواب اپنے ماموں واجد علی مرحوم سے
بیان کیا تو انہوں نے تعبیر دی کہ دو کتوبر روح اور نفس تھے۔ انہوں نے تم سے
درخواست کی کہ مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کر دو۔ مگر تم نے جو یہ کہہ دیا کہ تم خود ہی
روشنی کر لو اور انہوں نے اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کر لی، اس کا یہ مطلب ہے
کہ انشاء اللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو نورِ عرفان سے
منور فرما دیں گے۔ آئندہ اوراق بتائیں گے کہ یہ رویا شاید فطرت کا
ایک اشارہ تھا کہ ہم نے اس ہو نہار کو چن لیا اور برگزیدہ کر دیا۔ اہل بصیرت
سے یہ بات چھپی نہیں کہ کو طریق ولایت کسی واختیاری ہے مگر منصب ولایت محض
وہی ہے۔ ۱

اللہ یجتبیٰ الیہ من یشاء ویضار الخ بقول سیدی مدظلہ ۱

انہی کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے
وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

طریق اجتباء و طریق انابت
اللہ یجتبیٰ الیہ من یشاء ویضار الخ
۱ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے۔

اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو اپنا راستہ دکھاتا ہے (۱) اسی آیت سے صوفیاء کرام نے طے سلوک کے دو طریقے بتائے ہیں (۱) "طریق اجتباء" (۲) "طریق انابت" پہلے طریق میں "محبوبیت" کا غلبہ ہے اور دوسرے میں "محبیت" کا۔ "طریق اجتباء" کے چلنے والے میں سکون و قرار و طمانیت کی شان ہوتی ہے۔ انکسار و شائستگی اور تسلیم و رضا ان کا شعار ہوتا ہے۔ اپنی بیچاریگی اور اپنے ہمہ تن خطا و گناہوں کے لئے اس درجہ تصور ہوتا ہے کہ عبادت بھی کرتا ہے تو ندامت و شرمساری غالب رہتی ہے۔ "طریق انابت" کے چلنے والے میں ولولہ و شوق، اضطراب و التہاب کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی کیفیت تمام تر والہانہ و عاشقانہ ہوتی ہے دنیا سے وحشت عیاں ہوتی ہے۔ اور غلبہ عشق میں اس کی زبان سے بعض ایسے کلمات بھی نکلتے ہیں جو صورتاً خلاف ادب معلوم ہوتے ہیں۔ گو اس کا منشاء سوء ادب نہیں ہوتا۔

(دیکھو تبریز ترجمہ "ابریز" از مولانا عاشق الہی میرٹھی)

منہ بنہ : منہ بنہ

حصول علم

حکیم الامت کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں، حافظ حسین علی مرحوم سے کلام پاک حفظ کیا، پھر تھانہ بھون آکر مولانا فتح محمد صاحب سے عربی کی ابتدائی اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں پھر ماموں واجد علی صاحب مرحوم سے جوادب و فارسی کے استاد کامل تھے، فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد دیوبند پہنچ کر بقیہ نصاب کی تکمیل منفعت علی صاحب سے کی اور اس زبان پر پورا عبور حاصل کیا۔

قیام دیوبند ہی کے زمانے میں ایک مرتبہ خارش میں مبتلا ہو کر گھر تشریف لائے اور بطور مشغلہ فرصت ایک مثنوی "زیر و بم" لکھی جس سے آپ کی اس زبان میں ہمارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مثنوی سے پہلے ایک "اعتذار" لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔

"بعد الحمد والتحیۃ لحقیقہا والصلوٰۃ والسلام علیٰ لئیقہما، ہمی گوید

گرفتار درونالہ نادان ہشده سالہ خاکپاے درویشاں دگر درواہ

عشق کیشاں، در تہو بہ خمول افتادہ دگر درواہ زانویں گنہامی نہاد

الفقیر الی اللہ الغنی، العاجز الشرف علی غفر الغفار ذنوبہ و تزلزلت

عیوبہ کہ ایراتہائے چند برا نگینتم از سوز نہانی، و این سوز ہا

بیردن انگندم اندرد پنهانی۔ ہرچہ دردلم رختند رختیم و بختند
 بیختم، نہ از قافیہ آگاہیم نہ از دلیف اطلاعیم، نہ از دوائے خبر نہ
 از وزن بنائے، نہ عروض دایم نہ تقطیع خوانم۔ نہ اعتراض
 بر من رود نہ سولے بر من شود کہ مدعی نیم اعتراف قصور می کنم
 نہ مایہ دارم نہ بضاعتی، نہ سودے نہ تجارتی۔ اندبے زرد
 آید چہ سازد و اندبے پد آید چہ پرواز۔ پروبال شکستہ ام و
 اندبند اعتراض و جواب رستہ ام۔ والسلام فقط

محررہ ۱۲۹۸ھ

اب اس ہیچیدانی اور بے مائیگی کے اعتراف کے بعد علم و عرفان کے جو
 بیش بہا موتی پیش کئے گئے ہیں اور حسنِ سلیقہ سے ان کو پرویا گیا ہے۔ اس کا
 اندازہ ایک جوہر شناس ان چند لڑیلوں سے لگا سکتا ہے، اصل قصہ بیان
 کر کے اس کی معنویت کی طرف اب ذہن کو لارہے ہیں۔

قصہٗ اربابِ ظاہر ختم شد	حصہٗ اصحابِ باطن ماند خود
اہلِ ظاہر حفظِ خود برداشتند	حصہٗ اہلِ بطون بگذاشتند
نور و عرفان ساز حاصل لے سپر	تو ممکن بر قصہٗ ظاہر نظر!
ہست باطن گوہر و ظاہر صفت	گیر گوہر کن صدف را بر طرف
ظاہر ست انگور باطن ہچو مل	ہست چوں جز ظاہر و باطن چو کل
تا کجا باشی بد بکوری ظہور	سوئے باطن آدمین اشراق و نور

چوں شدی فارغ ز ظاہر انتاں آ بسوئے باطنش سازم بیاں
اس کے بعد مسائل باطن کی گہری کھولی ہیں۔ مثلاً دیکھئے فنا فی اللہ کے مقام
کو کس طرح بیان کیا ہے۔

ہمچنین کوشش نماید در طریق	تا کہ در بحر فنا باشد عزیز
خویشتن را چوں فنا فی اللہ کند	پس شود واصل بان ذات احد
یسمع بی بصر بی می شود	بی طش بی، نیصر بی می شود
قول او قول الہ ذوالجلال	فعل او فعل خدائے بہتال

شرک کے پیدا ہونے کی وجہ معلوم ہے؟ سنئے اس کی علت اصلی یہ ہے۔

غیر را خالق تصور می کند	پس ز جہل خویش مشرک می شود
زانکہ در ہر چیز نورش لامع است	اندر ان نور میں شہر بس طامع است
نور او اصل است و عکس نورش	پس در اصل و عکس نکند فرق آں
عکس را ہم اصل بنماید خیال	پس بیفتد در وبال و در نکال

وغیرہ وغیرہ۔

عربی کی ابتدائی تعلیم، جیسا کہ گذر چکا۔ وطن ہی میں ہوئی تھی۔ پھر آخر ذیقعدہ
۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور پانچ سال یہاں مشغول
تعلیم رہ کر شروع سالہ میں فراغت حاصل کی۔ اس وقت عمر شریف ۲۰، ۱۹
برس کے لگ بھگ تھی۔

طالب علمانہ حیثیت

زمانہ طالب علمی میں عام طلبہ اور عزیز واقارب سے الگ تھلگ ہے اگر کتابوں سے کچھ فرصت ملتی تو اپنے استاد خاص مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ (مدرس اول دارالعلوم دیوبند) کی خدمت فیض درجت میں جا بیٹھتے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو ایک طرف علم و فضل میں یگانہ تھے۔ اور دوسری طرف حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر ملی قدس سرہ کے خلفائے خاص میں سے تھے۔ ان کی اس جامعیت کی وجہ سے ان کا حلقہ درس "حلقہ توجہ" بھی ہوتا تھا، اور اسی ذہن و قلب کی ایک ساتھ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ طلبہ جب علم میں ایک خاص استعداد کی سند حاصل کر چکے تو کردار و اخلاق اور زہد و تقویٰ میں بھی امتیازِ شان کے حامل ہوتے تھے۔ افسوس کہ آج اکثر و بیشتر دینی درسگاہیں اس جامعیت فیض سے عاری ہیں۔

قصبہ دیوبند میں حکیم الامت کے کچھ رشتہ دار بھی رہتے تھے، انہوں نے اصرار کیا کہ کھانا گھر کا کھایا کریں البتہ رہائش مدرسہ ہی میں ہو۔ اپنے اپنے والد ماجد سے اس کی اجازت چاہی تو تربیت کے رمز آشنا والد نے ڈانٹ کر لکھا:-

”تم وہاں رشتہ داریاں جتانے گئے ہو یا طالب علمی کرنے؟ خبردار
جو کسی عزیز کے پاس آئے گئے۔“

اس تنبیہ کے بعد پھر اس اطاعت شعار فرزند نے پورے ۵ سال
تک کسی عزیز کی طرف رخ بھی نہیں کیا اور عام طلباء کی طرح زندگی گزارنے
رہے۔ یہاں تک کہ اب اگر کوئی خود ہی میل جول بڑھانا چاہتا تب بھی
بے رخی برتتے تھے۔ حتیٰ کہ بعضوں کو غرور کا دھوکہ ہو چلا تھا۔
آپ ابھی طالب علم ہی تھے۔ مگر بزرگوں کی دور میں نکاہیں اس دھند
ہی سے روز روشن کا پتہ لگا رہی تھیں۔

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارہ بلندی

چنانچہ جب مولانا رشید احمد گنگوہی (قدس سرہ) طلبہ کا امتحان
لیئے اور ان کو دستار فضیلت سے سرفراز کرنے کے لئے تشریف لائے تو
شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے اس شاگرد کی ذکاوت و ذہانت کی بڑی
تعریف کی، جناب محقق نے مشکل مشکل سوالات کئے اور ان کے برجستہ جواب
پاکر مسرور ہوئے۔

آپ کے ذہن کو علوم عقیدہ سے خاص متا سبت تھی، فطرت نے
ذہانت و فطانت، حاضر جوابی اور طلاقت لسانی کے جواہر پوری
طرح آراستہ کیا تھا، منطق میں مہارت کا اعتراف یوں فرماتے تھے:

”میں سچا بات کیوں نہ کہوں کیونکہ نہ میں متواضع ہوں نہ متکبر
جو چیز اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اس کا کیوں انکار کروں،
اللہ کی دین ہے۔ میرا کوئی کمال نہیں۔ الحمد للہ مجھے منطق میں
مہارت حاصل ہے۔ اور میں درحقیقت اس کو کوئی کمال بھی
نہیں سمجھتا کیونکہ بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی برکت سے
یہ ابھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے کہ

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

چنانچہ جب کوئی غیر مذہبی شخص اسلام کے خلاف مناظرہ کے لئے دیوبند
آتا تو آپ خلوت سے نکل آتے اور مخالف کے ہر دعوے کو باطل ثابت
کر دکھاتے۔ مگر تعریف کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اپنی ساری منطقی حجت
حمایت دین ہی میں صرف کی اور کبھی اس کو بقائے نفس کے لئے استعمال نہیں
فرمایا۔ اس وقت کے مناظروں کے سر تاج مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب،
آپ کی فن دانی کے متعلق فرماتے تھے۔

”بڑے سے بڑا مناظر بھی آپ کے آگے ٹھہر نہیں سکتا“

لیکن خود حکیم الامت یہ فرماتے تھے۔

”جتنا شوق مجھے اس زمانہ طالب علمی میں مناظرہ کا تھا اب

اس کی مضرتوں کی وجہ سے اتنی ہی نفرت ہے“

ادھر علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت کا یہ عالم کہ اہل فن اس کے مداح
اور ادھر تواضع اس درجہ کہ یہ باور کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آیا نفس موجود
بھی تھا؟ ^{۱۳} واقعہ کا، خبر ملی کہ دستار بندی و تقسیم اسناد کا
جلسہ بڑے شاندار پیمانے پر ہونے والا ہے، اور یہ رسم مولانا گنگوہی
قدس سرہ کے مقدس ہاتھوں انجام پانے والی ہے۔ اپنے ہم سبقوں کو
جمع کر کے استاد خاص مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی
”حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی،
اور سند فراغ دی جائے گی، حالانکہ ہم ہرگز اس کے اہل نہیں،
یہ تجویز منسوخ فرما دیجئے۔ ورنہ اس میں مدرسہ کی بڑی بدنامی
ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی ہے۔“

استاد کی شفقت کو جوش آیا۔ ان کی آنکھوں کے آگے ”شاگرد خاص“
کا مستقبل بجلی کی طرح چمک کر گذر گیا، یقین کی کیفیت الفاظ میں ڈھل کر نکل آئی:

”تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ
موجود ہیں اس لئے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں
آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر
معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے باقی سارا میدان

صاف ہے“

دنیا نے دیکھ لیا کہ استاد باکمال کی یہ بشارت حرف حرف صحیح نکلی مولانا

محمد یعقوب صاحب نے فتویٰ نویسی کا کام بھی اسی زمانہ میں آپ کے سپرد فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ جب فخر مشق مفتی نے ایک طویل استفتاء کا ویسا ہی مفصل و مکمل جواب لکھ کر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا تو عارف کامل استاذ نے اس پر دستخط کرتے ہوئے فرمایا۔

”معلوم ہوتا ہے تم کو فرصت بہت ہے، ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر تمہارے سامنے ہو گا اور پھر تم اتنے لمبے لمبے جواب لکھو گے۔“

آئندہ پتہ چلا گا کہ بصیرت یعقوبی کا یہ اشارہ کس قدر صحیح تھا۔ حق تعالیٰ کی بخشش کا ہاتھ جس پر کھل جائے۔ اور جس قدر کھل جائے اس کو کون روک سکتا ہے حکیم الامت کو جہاں اور محاسن ظاہری سے نوازا گیا تھا وہاں خوش الحانی سے بھی پوری طرح سرفراز کیا گیا تھا۔ آپ کی فن قرأت میں ہمارے ہمارے مل کر ایک عجیب دلاویزی پیدا کر دی تھی۔ آپ نے قرأت کی مشق مشہور عالم قاری محمد عبداللہ صاحب ہاجر ملی سے مکہ معظمہ میں کی، جو عرب کے قاریوں پر بھی اپنے ہمارے فن کا سکہ جما چکے تھے، حکیم الامت کی قوت آخذہ کا یہ عالم تھا کہ جب اوپر والی منزل پر شاگرد و استاد مشق کرتے کرتے ہوتے تو رہرو کے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ استاد کون ہے اور شاگرد کون؟۔ حکیم الامت جب قرآن پڑھتے تو حق تعالیٰ کی اس ”تجلی لفظی“ کی جھلک دکھائی دیتی تھی جس کی بنا پر کفار مکہ حضرت صدیق اکبر کو با واز بلند قرآن پڑھنے سے روکتے تھے، اور جس کی

وجہ سے لوگوں کا دل خواہ مخواہ کلام اللہ کی طرف کھینچتا اور حق کی تلوار کا گھاٹل ہوتا تھا۔ مولانا عین القضاۃ لکھنوی جیسے ماہر فن نے جب ایک مرتبہ آپ کے پیچھے نماز فجر پڑھی تو اس درجہ متاثر ہوئے کہ بعد نماز بہت اشتیاق سے کچھ اور سامعہ نوازی کی خواہش ظاہر کی۔

آپ کی اثر پذیر طبیعت کا یہ حال تھا کہ دارالعلوم کی حقیقت پر در فضلے بہت جلد متاثر ہو گئے۔ امیرانہ تکلفات ختم کر دیئے۔ فضولیات سے خود کو الگ کر لیا اور سادہ سی زندگی فقیرانہ روش اختیار فرمائی۔ ایک مرتبہ چھٹیوں میں گھر آئے اور اب جیسا کہ رنگ ڈھنگ ہو چکا تھا، بلا کسی اہتمام کے یونہی رضائی لپیٹ رکھی تھی۔ والد ماجد نے جو امیرانہ انداز کے خوگر تھے تو کا کہ میاں تمہیں رضائی اور ڈھننا بھی نہیں آتا؟

خاطر اثر میں ان فضولیات سے اس درجہ نفرت بیٹھ چکی تھی کہ باوجود سارے ادب و احترام کے بیساختہ کہہ اٹھے کہ اگر آپ کو رضائی اور ڈھننا سکھانا تھا تو مجھے مدرسہ دیوبند نہ بھیجتے وہاں تو کسی کو بھی رضائی اور ڈھننا نہیں آتا۔ سب ایسے ہی اول جوں رہتے ہیں۔“

والد صاحب یہ جواب سن کر دل میں خوش ہوئے۔

حکیم الامت طلبہ کے بناؤ سنگارا اور ان کے ادنیٰ چیزوں پر التفات سے بہت نفرت کرتے تھے۔ اور اس کی کس قدر حکیمانہ وجہ بتائی ہے۔

”یہ بناؤ سنگار اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو علم کا چرکا نہیں لگا۔“

افادہ علمی

تکمیل تعلیم کے بعد اب وقت آتا ہے کہ دارالعلوم سے جو فیوض حاصل کئے تھے اور استاد خاص کی توجہات نے جو علمی و عملی جامعیت پیدا کر دی تھی مدرسے سے نکل کر اسی فیض اور اسی رنگ کو عام کیا جائے۔

سبزہ کا آغاز ہے۔ جمال ظاہری اور کمال باطنی سے آراستہ ہیں اشاعت دین کے جذبہ سے معمور اور زلیور علم سے آراستہ ہیں۔ خود ذات میں بلا کی کشش ہے اور جب زبان فیض ترجمان کھلتی ہے تو پھر اثر اور نفوذ کا کیا پوچھنا۔ جس جگہ بیٹھ گئے عامی و عالم، مسٹر و ملا سب ہی گھر آئے اور اس نوجوان کے گونا گوں کمالات کے قائل ہو گئے۔

اس مقبولیت و احترام کے ساتھ آپ چودہ برس تک کانپور میں درس تدریس۔ تصنیف و تالیف اور وعظ کوئی و فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہے اور دیدہ و استاد کی پیشین گوئی حرف حرف صحیح نکلی کہ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے، باقی سارا میدان صاف ہے!

کانپور میں ایک مدرسہ قدیم سے چلا آ رہا تھا اور مدرسہ فیض عالم کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے صدر مدرس مولانا احمد حسن صاحب، ایک

جامع اور خصوصاً ماہر معقولات عالم تھے کسی وجہ سے ناراض ہو کر موصوف نے
 الگ مدرسہ قائم کیا۔ چونکہ طلباء میں ان کے وقار علمی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے
 کسی مدرس کو ان کی جانشینی کی جرأت نہ ہوتی تھی حکیم الامت کو اس حال کی خبر
 نہ تھی، جب کانپور والوں نے یہ خدمت آپ کے لئے پیش کی تو آپ نے اساتذہ
 اور والد ماجد کی اجازت سے صفر ۱۲۰۱ھ میں (پچیس روپیہ) ماہوار پر یہاں
 تشریف لے آئے۔ جو ان عمر تھے لیکن بہت جلد وہاں کے سارے مدرسین میں
 آپ کے علم و فضل کا شہرہ ہو گیا۔ خود سابق صدر مدرس بھی آپ سے محبت
 کرنے لگے۔

حکیم الامت اس سے پہلے کبھی مستند تدریس پر نہ بیٹھے تھے اور یہاں جو
 پہنچے تو اونچے درجہ کی کتابیں آپ کے سپرد ہوئیں۔ پہلے پہل طبیعت کچھ گہرائی
 لیکن دعاؤں نے سارے مراحل طے کر دیئے اور غیب سے آپ کی ہمت افزائی
 ہونے لگی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :

”احقر نے جب حدیث کا درس شروع کیا تو استاذی حضرت مولانا
 محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے اس طرح مشرف ہوا کہ
 میرے رو بہد ایک جماعت صحیح بخاری پڑھنے والوں کی موجود ہے اور
 ایک نسخہ بخاری کا میرے سامنے ہے جس میں دیکھ کر درس دیتا ہوں
 اور میرے برابر میں حضرت استاذی الممدوح تشریف رکھتے ہیں اور
 غالباً آپ کے پاس بھی ایک نسخہ بخاری تشریف کا ہے اور میں جو بیان

کرتا ہوں مولانا اس کی تقریر فرماتے ہیں :-

اسی طرح تفسیر کلام پاک سے مناسبت کا واقعہ سنئے۔ فرماتے ہیں:

ایک مقام ہے، جیسے کانپور میں جناب عبدالرحمن خاں صاحب بانی

مدرسہ جامع العلوم کانپور کا چھوٹا مطبع۔ وہاں کوٹھیں کے پاس

حضرت ابن عباسؓ کھڑے ہیں اور میں قریب ہوں۔ اس کے بعد

مجھ کو مناسبت تفسیر کا ظن غالب ہو گیا۔

اب معلوم ہو گیا کہ قدرت الہی خود آپ کے ذریعہ علوم کے دریا بہانا

چاہتی تھی۔ پھر کیا تعجب ہے اگر ایک طرف آپ کے درس و تدریس نے طلبہ کو

اور دوسری طرف آپ کی تقریر و وعظ نے اہل کانپور کو آپ کا فریفتہ بنا دیا ہے

اور یہ سب کچھ کیا کئی برسوں میں ہوا، نہیں صرف تین چار ہفتوں میں! اس

بندہ نواز کو نوازتے کیا دیر لگتی ہے، صرف اس کی چشم کرم کا مائل ہو جانا ہے

پھر دیکھئے کہ آن کی آن میں ایک مشت خاک کیا سے کیا ہو جاتی ہے!

مدرسہ کی مجلس تنظیمی نے حکیم الامت کی اس مقبولیت سے مالی فائدہ

اٹھانا چاہا اور آپ سے چندہ کی اپیل کی خواہش کی گئی، حکیم الامت اس

قسم کے چندوں کو بے ہمتی کا موجب اور ان کے لینے کو غیرت دینی کے

خلاف اور ناجائز سمجھتے تھے اس لئے اراکین مدرسہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی

نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، حضرت نے اس کی اطلاع

پاکر از خود استعفا پیش کر دیا اور باوجود اصرار کے پھر اس مدرسہ میں رہنا

گوارا نہ فرمایا۔

مدرسہ سے سبکدوش ہو کر اداۃ توبہ تھا کہ وطن لوٹ جائیں مگر
گھر جانے سے پہلے خیال آیا کہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی
کی زیارت کا مشرف حاصل کیا جائے۔ نہ جانے پھر کب اس کا موقع ملے۔
چنانچہ آپ خانوادہ نقشبندیہ کے اس قطب وقت کی خدمت میں پہنچ گئے۔
ادھر کانپور چھوٹا اور ادھر اہل کانپور کو اس نقصان عظیم نے مضطرب
کر دیا۔ عبدالرحمن خاں صاحب اور کفایت اللہ صاحب مرحوم نے
اس خیال سے کہ ایسی ہستی جو معقولات و منقولات کی جامع ہونا یا ب
ہے۔ اپنی طرف سے ۲۵ روپے کی سبیل نکالی۔ اور جب آپ گنج مراد آباد
سے گھر لوٹ رہے تھے تو آپ کو کانپور ہی میں روک لیا اور اس درجہ
مجبور کیا کہ ماننا ہی پڑا۔ اب آپ جامع مسجد محلہ ٹیکا پور میں درس دیے
لگے اور اس طرح ایک نئے مدرسہ کی بنا پڑی جس کا نام خود آپ نے مسجد کی
مناسبت سے "جامع العلوم" رکھا۔ جو اب تک قائم ہے۔ سچ ہے ۷
زندہ جو ظرف اٹھالے وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی میحسانہ بنے

اب تو آپ کی محبت لوگوں کے دلوں میں اس درجہ گھر کر گئی اور
ان کے خلوص نے آپ کو اس قدر متاثر کیا کہ آپ کے ذہن سے وطن کی
یاد محو ہو گئی۔ دن گذرتے گئے آپ کی تعلیم و تلقین سے سیکڑوں کے ذہن

قلب میں تعلیمات اسلامی کی عظمت و حقانیت جم گئی اور وہ اتباع سنت میں چست ہو گئے۔ مگر عین اس عالم میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ کا کام صرف اللہ ہی کے لئے ہونا چاہیے اس کے لئے معاوضہ لینا کچھ مناسب نہیں۔ چنانچہ ارادہ ہوا کہ طبابت کو ذریعہ معاش بنایا جائے۔ حکیم عبدالحمید خاں صاحب کی خدمت میں پہنچے تاکہ اس فن میں مہارت حاصل ہو لیکن یہاں پندرہ دن بھی رہنے نہ پائے تھے کہ کانپوری حضرات آئے اور اصرار کر کے پھر اپنے وطن لے گئے اور اس بازگشت پر بڑی خوشیاں منائیں۔

عَادَ الرِّمَاحَ لِرِوَضِي بَعْدَ مَازِهَا	وَعَمَّرَ اللَّهُ رُبْعِي بَعْدَ مَا نَحْسُ دَا
دیرے چمن میں بہا کر جا کر پھر آگئی	اور خدا نے میرے گھر کو دیرانی کے بعد پھر آباد کر دیا
وَنَزَيْتُ الْأَرْضَ خَضًّا بَعْدَ مَا يَسْبِتُ	وَالْبَرْقُ عَادَ سَنَا لَا بَعْدَ مَا اجْتَبَا
زمین خشک ہو کر پھر سرسبز ہو گئی	اور بجلی کی چمک چھپ کر پھر نکلی
وَفِي الْعِلْمِ عَيْنًا بَعْدَ مَا انْصَبَا	وَالشَّرْقُ الْفَضْلُ شَمْسًا بَعْدَ مَا غَابَا
(اور علم کا چشمہ سوکھ کر پھر رواں ہوا)	اور علم و فضل کا آفتاب ڈوب کر پھر نکل آیا

مرشد برحق حضرت حاجی صاحب نے بھی اس واپسی پر بڑی مسرت ظاہر کی، تحریر فرمایا:

”آپ کی طبابت کے شغل کو ترک کر کے پھر کانپور تشریف لا کر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہوا۔ بہت خوشی ہوئی، اللہ جل جلالہ آپ کی اس

خدمت میں برکت دیکر آپ کے برکات و فیض سے تمام مسلمانوں کو
 مستفیض و مستفید کرے۔ میں نے قبل ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ دین کو
 خوب مضبوط پکڑنا چاہیے، دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر
 رہے گی۔ بہر کیف آپ لوگ علماء و رشتہ الایمان ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ
 نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کئے ہیں
 پس اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیے۔

از مکتوبات امدادیہ ۳ مورخہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ

شیخ کے ان ارشادات اور سمیت افزائیوں کے بعد آپ نے پورے ۱۱۴
 برس درس و تدریس میں گزار دیئے۔ اور پھر خود شیخ ہی کی ایمل سے آخر صفر ۱۳۱۵ھ
 میں کانپور کا تعلق ترک کر کے تھانہ بھون میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔
 اس مراجعت پر حضرت شیخ نے بڑا اطمینان ظاہر کیا اور گویا آپ کے فیض کے
 بڑھنے اور پھیلنے کی پیشین گوئی فرمادی، تحریر فرمایا۔

”بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ خلائق کثیر کو
 آپ سے فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو
 ابد سر نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔“

از مکتوبات امدادیہ ۳۶ (مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ)

حکیم الامت کو ابتداء سے لے کر آخر عمر تک طلبہ سے خاص محبت رہی اور
 ان کا خاص لحاظ فرماتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

”مجھ کو شاگردوں سے جتنی محبت ہے، مریدین و معتقدین سے اتنی نہیں
شاگرد تو اولاد کی طرح ہوتے ہیں شاگردی اور استاد کی کا تعلق نہایت
مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے اور عقیدت کا تعلق اکثر ناقابل اعتبار۔“

(ملفوظات اسعد الابرار)

خود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم سمجھتے رہے فرمایا کرتے :
”مجھے پیر حیوں والی درویشی نہیں آتی، میں تو ایک طالب علم ہوں
مجھ سے تو قرآن و حدیث کی باتیں پوچھی جائیں مجھے تو سید ہاسادا
قرآن و حدیث ہی آتا ہے اور اسی کو اصل درویشی سمجھتا ہوں۔“
اور یہ بھی فرماتے تھے :

”صوفیہ سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے کیونکہ انہی کی بدولت
آمنظام دین قائم ہے۔“

علماء کی اس اہمیت کے پیش نظر آپ کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ
علم دین سیکھنے والوں کے وقار کی بہر طور حفاظت ہو۔ اور آئندہ ان کو
جس منصب جلیل پر فائز ہونا ہے اس کے مد نظر ابتدا ہی سے ان کے
حوصلوں کو بلند رکھا جائے۔ چنانچہ آپ طلبہ کو ہر اس چیز سے روکتے
تھے جس سے ان کا یہ جوہر پائمال ہو، مثلاً قدیم رواج کے مطابق طلبہ کو بھی
کسی کے گھر جا کر کھانا لانے یا کسی کے ہاں فقیروں اور محتاجوں کی طرح دعوت
کھانے کی اجازت نہ دیتے تھے، خانگی کام نہ خود لیتے تھے اور نہ کسی اور

استاذ کو اس کی اجازت تھی، کسی غیر شخص کی مجال نہ تھی کہ طلبہ کو کسی غلطی پر
 راست تہنہ کر سکے، اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکت کر بیٹھتا تو آپ اس کو
 ہرگز گوارا نہ فرماتے بلکہ اس پر سخت گرفت کر کے آئندہ کے لئے جتا دیتے
 کہ طلباء کی عظمت اور ان کا وقار اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر کس و نا کس ان بچے
 گرفت کرے، جو کوئی شکایت ہو وہ مدرسین کے علم میں لائی جائے تاکہ وہ
 خود اس پر مناسب سزا تجویز کریں یا کوئی اور اصلاحی قدم اٹھائیں مشرقی
 طرز کے تعلیم یافتہ حضرات میں آج بھی ان مصالح کا شعور مشکل ہی سے
 پایا جاتا ہے اور بالعموم وہ طلبہ کے وقار کے تحفظ کو اہمیت نہیں دیتے
 نتیجہ یہ کہ یہ طلباء آئندہ عملی دنیا میں احساسِ لپتی میں مبتلا نظر آتے ہیں!

اصول تعلیم

حکیم الامت ۱۴ سال کی طویل مدت تک کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں درس دیتے رہے اور اس عرصہ میں آپ کے ذریعہ بیسیوں ایسے اہل کمال پیدا ہو گئے جنہوں نے اقطاع ہند میں پھیل کر علم کا نور بھیلایا، ان میں سے صرف چند کے نام درج ذیل ہیں۔

مولوی محمد اسحق صاحب بردوانی جنہوں نے جامعیت علوم کی بنا پر مدرسہ کانپور میں اپنے استاذ حکیم الامت کی جانشینی کا شرف پایا اور پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پہنچ کر علم دین کی شمع جلائی۔

مولوی احمد علی صاحب نے فقہ میں یدِ طولی حاصل کیا اور فتح پور اور ضلع بارہ بنکی میں رہ کر اپنے اس فیض خاص کو عام کیا۔

مولوی فضل حق صاحب ساکن بارہ بنکی ضلع الہ آباد جنہوں نے، ”مثنیٰ التکریر“ کی اعلیٰ تقریر لکھ کر علوم فلسفہ سے اپنی مناسبت خاص کا ثبوت دیا، اور ایک عرصہ تک فنوج میں مسندِ درس کو زینت بخشی۔

مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری جن کو عربی ادب اور معقولات میں ایسی مہارت حاصل تھی کہ حکیم الامت جب وعظ کرتے ہوتے تو آپ

عربی میں اس کے نکات قلمبند فرماتے اور پھر اس کو اردو میں مفصل اس
انداز سے لکھتے کہ اصل میں فرق نہ آنے پاتا، "الانتباہات المفیدہ عن
الاشتباہات الجدیدہ" (جو نو تعلیم یافتہ طبقہ کے شبہات کے رو میں مولانا
تھانوی کا جواب رسالہ ہے) کی ایسی شرح لکھی جس سے آپ کا محقولات میں
تجربہ ظاہر و خیال ہے۔

مولوی سید اسحق علی صاحب کانپوری جو الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے
پروفیسر رہے۔

مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی، آپ حکیم الامت کے خواہر زادے
بھی ہیں اور آپ کی استعداد علمی پر حکیم الامت کو اعتماد کئی تھا اسی لئے
"اعلا السنن" کا دقیق علمی کام آپ ہی کے ذریعہ کروایا گیا اور اس کی تکمیل پر
مولانا تھانوی نے اظہار مسرت بھی فرمایا۔ یہ گیارہ جلدیں مولوی صاحب
نمدوح کی فقہ و حدیث میں مہارت و نظر دقیق کا مظہر ہیں، آپ ہندوستان
و پاکستان کے گنے گنے علماء میں سے ہیں۔

غرض ایسے استاذ کامل کے اصول تعلیمی جس کی آغوش تدریس سے ایسے
ایسے علماء و فضلاء نکلے۔ اس قابل ہیں کہ ان کا بطور خاص ذکر کیا جائے، ان کو
سمجھا جائے اور ان پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ اصول یہ ہیں:

(۱) استاذ جو بھی مضمون پڑھائے۔ اس میں خود زیادہ مشقت اٹھائے
اور اس کو آسان ترین صورت میں شاگردوں کے آگے رکھ دے۔ گویا اس

طریقہ میں استاذ پر کافی بار پڑتا ہے۔ مگر جذبہ شفقت اس بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس میں یہ جذبہ نہ ہو وہ مستند درس پر کیوں آئے؟

(۲) پیچیدہ مقام کو پہلے بہت ہی آسان پیرایہ میں سمجھایا جائے اور جب بات ذہن نشین ہو جائے تو اس مسئلہ کا اصطلاحی تعارف کروایا جائے، چنانچہ آپ کے ایک شاگرد مولوی فضل حق صاحب (جن کا ذکر اوپر آچکا) جب صدر کے مشہور مقام "ثناۃ بالتکریر" پر پہنچے تو آپ نے پہلے مسئلہ کا نام لئے بغیر اس کی تشریح خوب ذہن نشین کرا دی اور بعد میں فرمادیا: "یہ وہی مقام ہے جس کو ثناۃ بالتکریر کہتے ہیں" اس پر وہ دنگ رہ گئے کہ ہم تو اس مسئلہ سے بہت گہرا تے تھے۔ مگر یہ تو کچھ مشکل نہ نکلا۔ واقعہ یہ ہے کہ رہو کو اگر منزل کی دوری و دشواری کا علم پہلے ہی سے ہو جائے تو اس کی کمر مت بیٹھ جاتی ہے ورنہ پھر کمزور سے کمزور بھی چل نکلتا ہے اور منزل کو پالیتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی امر ہے۔ اور اساتذہ خواہ کوئی مضمون پڑھاتے ہوں ان کا نفسیات سے واقف ہونا ناگزیر ہے، اسی واقفیت و عدم واقفیت پر ان کی کامیابی و ناکامی اور طلباء کی نچنگی و ناکامی کا مدار ہے اور

(۳) طلبہ کے آگے ضرورت سے زیادہ تقریر نہ کی جائے اور محض انہی قابلیت کے اظہار کے لئے اصل مطلب کو سمجھایا نہ جائے۔ چنانچہ آپ اپنے

ماتحت مدرسین پر اس نقطہ نظر سے کڑی نگرانی رکھتے تھے۔

(۴) ہفتہ واری تقاریر اور مباحثے نہ رکھے جائیں کیونکہ اس کے باعث طلبہ کی توجہ اسی ایک موضوع تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس سے لچپی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے جس کی حقیقت کو آج بھی جانچا جاسکتا ہے کالج اور جامعات کے وہ طلباء جو تقریر و مناظروں کے پختہ کار ہوتے ہیں، وہ امتحانوں میں کیا درجہ پاتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہی نہیں جو حکیم الامت نے بتلائی؟ آپ فرماتے تھے کہ جب نصاب کی تکمیل اچھی طرح ہو جائے تو پھر تقریر و مناظرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے خامی رہ جاتی ہے۔ اس جملہ ذریعہ کے پہلے حصہ کا ثبوت خود صاحب قول کی شخصیت ہے اور اس کے دوسرے ٹکڑے کے ثبوت میں آجکل کے وہ سب طلباء آ جاتے ہیں جو طالب علمی کے دور میں اپنے اندر لیڈری کے جراثیم کو نشو و نما دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تباہی تو تھامتا اسی حکیمانہ رمز سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے!

(۵) طالب علم میں استعداد علمی پیدا ہونے کے لئے تین باتیں شرط لازم کا درجہ رکھتی ہیں:

(۱) وہ آئندہ سبق کا مطالعہ کر کے معلومات اور مہولات میں تمیز

پیدا کرے۔

(ب) پھر جب استاد سمجھانے لگے تو بلا سمجھے آگے نہ بڑھے

(ج) جب سمجھ چکے تو خود بھی اسی مطلب و مفہوم کو بیان کرے۔

(۵) مذکورہ بالا تین باتیں تو واجب ہیں، ایک بات درجہ استحباب کی ہے وہ کہ کچھ آموختہ روزانہ پڑھ لیا کرے۔ اب یا درجہ نہ رہے استعداد انشاء اللہ ضرور پیدا ہو جائے گی۔

یہ وہ اصول ہیں جس کے ذریعہ طالب علم کو ۳۳ فیصدی والی کامیابی نہیں بلکہ درجہ اول کی کامیابی نصیب ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ۳۳ فیصدی والی کامیابی تو انگریز کے طرز تعلیم کی آوردہ ہے، ورنہ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں اس درجہ کی کامیابی کوئی کامیابی ہی نہ تھی، کامیاب وہی ہوتا تھا جو پڑھی ہوئی کتاب پڑھا بھی سکے۔

۱۰) کسی طالب علم کو اس کی مناسبت یا دلچسپی کے خلاف علوم سیکھنے پر مجبور نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کو اس بنا پر سند سے محروم کیا جائے مثلاً اگر کوئی محققات نہ پڑھے اور محض دینیات پڑھے تو اس کو بھی سند ضرور دی جائے "دست" کے جو معقولات اور دینیات کی جملہ کتابوں پر حاوی اصطلاح ہے، صرف "دینیات" لکھا جائے حکیم الامت کا خاص وصف یہ ہے کہ کبھی نفسیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں فرماتے تھے بلکہ پوشیدہ سے پوشیدہ امور تک بھی آپ کی نظر پہنچ جاتی تھی۔

ہمارا قدیم نظام تعلیم اور انگریزوں کا مروجہ جدید نظام تعلیم دونوں ہی اس نقطہ نظر سے قابل ترمیم اور لائق اصلاح ہیں۔ نہ ہر طالب علم کے لئے ستم دشمن بازغہ اور حدیث و قرآن کی ایک ساتھ تعلیم ضروری و مناسب حال ہے اور نہ ہر ایک کے لئے تاریخ و جغرافیہ، ریاضی سائنس اور انگریزی وارد و ادب کا لزوم قرین عقل ہے۔

اکابر عصر کی خدمت میں

صوفیاء کرام کا مشہور مقولہ ہے:

یک درگیر و محکم گیر

یعنی اپنا معالج و مری جب ایک کو بنا لیا تو اب اسی کے ہو رہو، اسی کو اپنے
حق میں سب سے زیادہ "نافع" سمجھو اپنے علاج کے خیال و گمان سے بھی اب کسی
اور پیر کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ، گو کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو غ
ابن مریم ہوا کرے کوئی

اور یہ سختی مبتدی اور غیر مستحکم سالک کے لئے ہے ورنہ جس کا رابطہ
قلبی اپنے شیخ سے کامل ہو چکا اس کے لئے اور بزرگوں کے فیض صحبت و نہ کہ فیض
ترہیت! کی ممانعت بھی باقی نہیں رہ جاتی اور وہ ایک ہی کارہتے ہوئے سب سے
فائدہ اٹھا لیتا ہے، شیخ شیراز سعدی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے ۷

تمتع زہر گوشہ یافتم
زہر خرمیٰ نے خوشہ یافتم

۷ ملاحظہ ہو ارشاد الطالبین از قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ
نیز ملفوظات حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ

مولانا تھانویؒ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے مرید تھے اور پختہ مرید اس لئے آپ کا یہ تعلق اور بزرگانِ عصر کی تعظیم یا ان کی خدمت میں آپ کی حاضری سے مانع نہ تھا، چنانچہ آپ اپنے وقت کے تقریباً اکثر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اور ان کی شفقتوں، دعاؤں اور توجہات سے فائدہ اٹھایا ہے،

خود بارہا فرمایا کرتے تھے:

”نہ کبھی طالبِ علمی میں میں نے محنت کی نہ اس طریق میں کبھی مجاہدات اور ریاضیات کئے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، سب اپنے حضراتِ اساتذہ اور مشائخین کی دعا و توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے۔“

ابتداءً آپ مولانا رفیع الدین صاحب۔ مجددیؒ ہنتم مدرسہ دیوبند کے حلقہ توجہ میں شریک رہے ہیں اور فرماتے تھے کہ اس قدر با اثر محسوس ہوتا جیسے بالکل پاک صاف ہو گیا ہوں۔ مولانا رحمۃ اللہ کے ساتھ آپ نے سرہند پہنچ کر حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی اور واپسی میں ریاست پٹیالہ میں ان مقامات کی بھی زیارت کا شرف پایا جہاں پر بنائے کشف بعض انبیاء علیہم السلام مدفون ہیں۔ مولانا ممدوح کو آپ سے اس درجہ محبت تھی کہ مدتوں آپ سے اپنی مسجد میں امامت کروائی۔

خالو زادہ نقشبندیہ کے دو چشم و چراغ شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ

اور شاہ ابوالاحمد بھوپالیؒ بھی تھے۔ آپ ان بزرگوں کی زیارت سے بھی مستفیض ہوئے ہیں اور ان کے خصوصی برتاؤ سے ممتنازر رہے ہیں۔ قطب وقت شاہ فضل الرحمن قدس سرہ سے تو اس درجہ محبت بڑھی کہ انہوں نے آپ کو اپنے احوال سنائے جو اوروں سے چھپاتے تھے مثلاً فرمایا ”کہنے کی تو بات نہیں لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے پیار کر لیا۔ بھائی جنت کا مزرہ برحق، کوثر کا مزرہ برحق، لیکن نماز میں جو مزرہ ہے کسی چیز میں نہیں۔ بھائی ہم تو قبر میں بھی بس نماز ہی پڑھا کریں گے۔ دعا ہے کہ ہمیں تو اللہ میاں قبر میں یہ اجازت دیں کہ بس نماز پڑھتے جاؤ۔“

کسی عقد کی شرکت کے سلسلہ میں پہلی بھیت جانا ہوا، یہاں ایک مشہور بزرگ شاہ محمد شیر خاں صاحبؒ تھے، آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا چاہی کہ دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جائے، اس پر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اپنے دو لوں ہاتھوں کو رگڑو، جب آپ اس حکم کی تعمیل کر چکے تو پوچھا کہ کچھ گرمی پیدا ہوئی، عرض کیا کہ ہوئی۔ فرمایا بس اسی طرح قلب کو رگڑے جاؤ۔ انشاء اللہ محبت کی گرمی پیدا ہو جائے گی۔

حافظ غلام مرتضیٰ صاحبؒ مجذوب پانی پتی جن کی دعائیں آپ کی پیدائش کا ذریعہ بنیں، ان مجذوب صاحب کے ایک صاحبزادے پیر احمد صاحبؒ بڑے صاحب کشف اور صاحب حال و قال بزرگ تھے، ان کو

حکیم الامت سے اس درجہ محبت تھی کہ جب اپنے مرید کی دعوت پر تھا نہ بھون
تشریف لاتے تو غایت شفقت سے خود جا کر ملتے۔ ایک مرتبہ ادھر یہ
گھر سے نکلے اور ادھر حکیم الامت آپ کی زیارت کے لئے خود بھی اپنے گھر سے چلے
تو پیر صاحب تھوڑی دور چل کر اپنے گھر لوٹ گئے کہ اب تو وہ خود ہی آ رہے ہیں۔
کشف ہو گیا!

آپ حافظ تفضل حسین صاحب ساکن بکھرہ ضلع منظر نگر اور حافظ احمد حسین
صاحب شاہجہانپوری کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ہیں اور ان کی دعاؤں اور
محبتوں سے شاد کام رہے ہیں۔ حافظ صاحب شاہجہانپوری نے ایک مرتبہ
کسی کے لئے بددعا کی اور وہ شخص دفعتاً مر گیا تو حافظ صاحب ممدوح نے
پریشان ہو کر آپ سے تحریراً دریافت کیا کہ مجھے قتل کا گناہ تو نہیں ہوا!
اس کا جواب آپ نے بہت جامع اور تشفی بخش دیا، اس سے حافظ صاحب
کے کمال تقویٰ کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ ان کی نظر میں آپ کی کیا وقعت
تھی!

صوفی شاہ سلیمان صاحب لاہوری، ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں
خود ان بزرگ نے آپ سے کئی بار ملاقات فرمائی۔ ایک مرتبہ آپ راندیرہ سے
سورت جا رہے تھے اور صوفی صاحب سورت سے راندیرہ راستہ میں ایک پل پر
دو لوگوں کی ملاقات ہوئی تو صوفی صاحب راندیرہ پہنچ کر دیر تک ایک مسجد میں بیٹھے رہے
رہے اور کسی کے پوچھنے پر حکیم الامت کا نام لے کر کہا: نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے۔

ایک سلسلہ سفر میں مولانا غلام محمد صاحب دین پوری۔ مولانا تاج محمد صاحب امرودی اور پیر چھبند صاحب جہم اللہ تعالیٰ (جو سندھ کے مشہور مشائخ ہیں) سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی اور سب نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ پیر چھبند صاحب نے ایک قیمتی خرقة بھی عطا فرمایا اور اپنے مریدین کو وصیت فرمائی کہ جس امر میں اختلاف ہو آپ ہی سے رجوع کریں۔ مولانا تاج محمد صاحب نے اپنے ایک مرید غلام حسین صاحب ہیڈ ماسٹر اسکول چاکیان شہزادہ کوٹ (ضلع لاڑکانہ سندھ) کے خط میں حکیم الامت سے متعلق یہ رائے تحریر فرمائی:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب چونکہ اہل حق ہیں، ان کی محبت حق تعالیٰ اہل شانہ کی محبت ہے۔“

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے آج کا ہر مسلمان واقف ہے۔ اور سیاسیات میں شیخ الہند اور حکیم الامت کی رائے میں جو اختلاف تھا وہ بھی آشکار ہے۔ اس کے باوجود شیخ الہند آپ کا اس درجہ احترام فرماتے تھے کہ ”سراپا فضل و کمال“ اور ”معدن حسنات و خیرات“ کے القاب سے مخاطب فرماتے تھے۔ اسی طرح جب بعض بدخواہوں نے اختلاف رائے کی وجہ سے آپ کو حضرت تھانوی سے برگشتہ کرانا چاہا تو آپ نے جواب دیا:

”افسوس تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے ہو جس کو میں ایسا الیسا

(حکیم الامت نے ازراہ تواضع وہ الفاظ بتلائے نہیں) سمجھتا ہوں

میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر کوئی وحی آتی ہے؟ میری ایک رائے
 ہے اور ان کی ایک رائے اس میں اعتراض و شکایت کی کیا بات ہے؟
 قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی سے سب واقف ہیں اہل دل
 حضرات کے پاس آپ مسلمہ طور پر قطب ارشاد تھے۔ حکیم الامت نے پہلے
 آپ ہی سے بیعت کی درخواست کی تھی اس لئے تا آخر حیات آپ کے ساتھ
 شیخ ہی کا سا سلوک رکھا۔ آپ کی عقیدت و محبت کا اندازہ آپ کے ان الفاظ
 سے ہو سکتا ہے۔ فرماتے تھے میں نے ایسا جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی نہیں
 دیکھا اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی ہے۔ اور مولانا کے
 ساتھ غیر استدلالی دلائل سوچنا بھی خلاف ادب سا معلوم ہوتا ہے۔ قیام ^{بھون} تھانہ
 کے زمانہ میں حکیم الامت کے مواعظ و مشاغل کا حال سنا کہ آپ بہت خوش
 ہوتے تھے اور فرماتے تھے:

”یہ سب کچھ ہے مگر مجھے تو پوری خوشی اس وقت ہوگی جب کچھ اللہ
 اللہ کرنے و نے بھی وہاں جمع ہونے لگیں۔“

چنانچہ قطب الارشاد کی یہ دعا بھی پوری ہوئی اور خالق تھانہ بھون
 اللہ اللہ کرنے والوں کا مرجع بن گئی۔

اسی دور کے ایک اور بزرگ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری
 ہیں جو حضرت گنگوہی کے خلیفہ اعظم اور علم و عمل میں اپنی آپ نظر تھے۔
 مولانا تھانوی کے متعلق فرماتے تھے:

”مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جس وقت ان کو خبر بھی
 نہ تھی۔“ آپ کے مواعظ کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے۔
 ”ان کے بیان میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں، ان کے ہوتے کسی کا وعظ
 کہنا منہ چڑانا ہے۔“

بعض حاسدوں نے فریقین کے تعلق کو خراب کرنا چاہا اور چھوٹی روایات
 خدمت خلیل میں پہنچائیں۔ جب حکیم الامت کو اس کی خبر ہوئی تو صفائی کے لئے
 ایک عریضہ لکھا اور حقیقت حال ظاہر کر دی، جواب آیا:
 ”نہ معلوم لوگوں کو کیا مرہ آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہل خیر کے
 قلوب کو دکھاتے ہیں مجھ ناچیز کو جو تعلق محبت پہلے تھی وہی عقیدت و محبت
 بحمد اللہ موجود ہے۔“

آں نیست کہ حافظ رامہرت روداد اند خاطر

آں وعدہ پیشینش تا روز پس میں باشد

ان کے علاوہ آپ نے اور بزرگان عصر سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کے
 لطف و کرم سے شاد کام ہوئے۔ مثلاً مولانا عبدالحی فرنگی محلی و مولانا محمد نعیم
 فرنگی محلی اور مولانا خلیل پاشا ملی (مقام مکہ معظمہ) وغیرہ کو اپنے علم و
 اخلاص سے متاثر کیا اور سب کے دل میں جگہ حاصل کی اہل حق میں یہ مقبولیت
 ایک عطیہ ربانی ہے۔

مختلف بزرگان دین کا اور خصوصاً اپنے شفیق اساتذہ کے علمی و عملی

کمالات کا تذکرہ ہوتا تو آپ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری رہتی اور دیر تک
حال قایم رہتا، پھر فرماتے سہ

اُولَئِكَ اَبَانِيُ فَجَنِّي بِمَثَلِهِمْ

اِذَا جَمَعْتَنِيَا جِرِي الْمَجَامِعِ

‡

آپ بزرگوں کے تذکرہ کو اس درجہ مفید سمجھتے تھے کہ ”نزہت البساتین“
کے نام سے ایک ہزار حکایات خود آپ نے جمع کر کے شائع کروائیں اور بہت
وثوق سے فرماتے تھے۔

”یہ حضرات عشاق تھے ممکن نہیں کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور

اور قلب میں محبت الہی پیدا نہ ہو۔“

‡

شیخ دوران سے تعلق اور حج بیت

گزر چکا کہ حکیم الامت کی پیدائش ایک مجذوب کامل کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اور انہی بزرگ نے آپ کا نام اشرف علی رکھا تھا اور آخر وقت تک اپنی محبت و توجہ سے نوازتے رہے، ادھر مولانا فتح محمد صاحب کی صحبتیں اور عنایتیں بھی شامل حال تھیں، یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے غیر شعوری طور پر آپ میں عشق کے جلوے دکھائی دیتے تھے، ایک مرتبہ قطب ارشاد حضرت گنگوہیؒ کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تو آپ ایک ہی نظر میں گھائل ہو گئے، شوق سے مصافحہ کے لئے آگے بڑھے، لیکن جوش نیاز مندی نے بے قابو کر دیا تھا، پاؤں بے اختیار پھسل پڑا۔ اور حقیقتاً پاؤں کیا پھسلے دل ہاتھ سے نکل گیا۔

دل می روز وستم صاحب دلاں خوار را

دردا کہ راز پنہاں خواہد شد اشکارا

شیخ گنگوہیؒ نے تھام لیا۔ گو بیعت اور اس کی حقیقت سے نا آشنا تھے مگر کشش اس بلا کی ہوئی کہ بیعت کی درخواست پیش کر دی۔ حضرت نے دوران تعلیم اس کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرما دیا۔ لیکن خاطر اشرفین

یہ خیال بصورت حسرت نمود پاتا رہا۔ اور جب ۱۲۹۹ھ میں مولانا گنگوہی عازم حج ہوئے تو خود انہیں کے ہاتھ شیعہ دوراں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کی خدمت میں ایک عریضہ گزارا اور درخواست کی کہ آپ مولانا سے فرمادیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں۔ "نہ جانے دونوں عرفاء میں کیا راز و نیاز رہا، بہ ظاہر یہی ہوا کہ حضرت حاجی صاحب نے اس عریضہ کے جواب میں خود ہی بیعت فرمالیا۔

اس وقت آپ کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

حضرت حاجی صاحب نے جس وقت ہندوستان کو خیر باد کہا ہے، تو ابھی مولانا تھانوی کی ولادت بھی نہ ہوئی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ جب بصیرت کی آنکھ کھل جاتی ہے تو زمان و مکان کے سارے قیود اور رجحانات اٹھ جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نادیدہ عاشق صادق اویسی رضی اللہ عنہ کی زبانی اس حقیقت کو سنئے فرماتے ہیں۔

"زندہ اور چلتے پھرتے لوگوں کی طرح رعوں کے بھی جان ہوتی ہے۔

مومنین خواہ کبھی آپس میں نہ ملے ہوں اور نہ ان میں کوئی تعارف ہو،

اور نہ باتیں کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ لیکن وہ سب ایک دوسرے کو

پہچانتے ہیں اور خدا کی روح کے وسیلہ سے باتیں کرتے ہیں خواہ

وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں۔"

غرض عارف باللہ شیخ العرب والعجمؒ نے تھانہ بھون کے اس دورِ اشرف
کی چمک مکہ معظمہ میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لی۔ اور آپ کے والد ماجد کو لکھ بھیجا۔
”تم حج کو آؤ اور جب آؤ تو اپنے لڑکے کو لیتے آؤ۔“

یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ مولانا گنگوہیؒ کے ذریعہ ابھی تعارف بھی
نہ ہوا تھا، مگر بہر حال شیخ کی کشش تو تھی ہی کچھ غیب سے اس کے سامان یوں پیدا ہوئے
کہ مدرسہ دیوبند کی طرف سے تجارت کی ایک کمپنی قائم کی گئی اس میں مولانا تھانویؒ
کے والد ماجد نے تین حصص پانچ پانچ سو کے خریدے، ایک اپنے نام سے اور
دو اپنے دونوں صاحبزادوں کے نام سے لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد کسی وجہ سے
ان حصص کی رقم واپس لے لی، اس پر آپ نے تحریراً پوچھا: ”یہ پانچ سو روپیہ
جو آپ نے میرے نام سے جمع کئے تھے اور اب واپس لئے ہیں میری ملک ہیں یا
آپ کی؟ جواب آیا: ابھی تک تو یہ رقم میری ہی ملک تھی اور تمہارا نام مصلحتاً
درج کروایا گیا تھا۔ لیکن اب میں اس رقم کو دراصل تمہاری ہی ملک قرار
دیتا ہوں۔“ اس پر فرزندِ سعید نے عرض کی: ”پھر اس رقم کی زکوٰۃ بھی میرے
ذمہ واجب ہے اور اب حج بھی مجھ پر فرض ہو گیا۔“ پدرِ بزرگوار نے ادائی
زکوٰۃ کے لئے تو فوراً روپیہ بھجوا دیا۔ البتہ حج کے متعلق لکھا کہ اس سال
تمہاری چھوٹی بہن کے عقد سے فراغت ہو تو آئندہ سال حج کا قصد ہے۔ اس وقت
تم بھی چلے چلنا۔“ آپ نے اس موقع پر فرزندِ نادانہ ناز سے کام لیا اور
لکھا: ”آپ مجھے یہ لکھ کر دیجئے کہ تم پانچ سال تک ضرور زندہ رہو گے۔“

میرے ذمہ تو حج فرض ہو چکا اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں پھر اس میں تاخیر بلا
شرعی جائز نہیں۔ اس لئے مجھے تو اسی سال حج کرنا ضروری ہے۔ آپ کے
اس اصرار کو دیکھ کر آپ کے والد ماجد نے اپنی صاحبزادی کے عقد سے جلدی
فراغت حاصل کی اور حج کا عزم فرمالیا۔ کیونکہ محبت اس کی اجازت نہ دیتی تھی
کہ آپ کو تنہا سفر کرنے کی اجازت دی جائے۔

یہ سوال ^۳ کا ذکر ہے جب آپ نے اپنی طالب علمانہ زندگی
ختم کر کے ابھی مسند تدریس سنبھالی تھی اور کانپور میں مقیم تھے۔

غرض حج کے سامان ہو گئے اور آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ زیارت
حرمین کے لئے روانہ ہو گئے، شوق کا یہ عالم تھا کہ جب کسی نے سمندر کے
غیر معمولی متلاطم ہونے کا ذکر کیا تو جوش سے کہہ اٹھے ہ

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں پشتیان

چہ باک از موج بحر آنرا کہ دارد لوح کشتیان

اسی جذبہ سے معمور مکہ معظمہ پہنچے، شیخ عالی مقام سے نیاز حاصل کیا،
جو نعمت آنکھوں سے دور تھی سامنے آگئی، خود حضرت شیخ بیحد خوش ہوئے اور
دست بدست بیعت سے سرفراز کیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد اپنے
مرید سے فرمایا: ”تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔“ حکیم الامت کیلئے
اس سے زیادہ مسرت کا کیا موقع ہو سکتا تھا لیکن آپ کے والد ماجد نے
آپ کی جدائی گوارا نہ کی اور شیخ قدس سرہ نے احترام شریعت کی بنا پر اپنے

مرید کی یوں تسلی فرمائی کہ ”والد کی اطاعت مقدم ہے، اس وقت چلے جاؤ پھر
دیکھا جائے گا۔“

چنانچہ آپ ۲۰ سالہ عمر میں سعادت حج پا کر ۱۳۰۲ھ میں خواہی نہ خواہی
ہندوستان لوٹ آئے۔

قیام مکہ معظمہ کے دوران میں مولانا تھا نوئیؒ پر ارض پاک کا احترام و
ادب اس درجہ غالب رہا کہ وہاں تھوکتے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا اور جس وقت
بیت اللہ شریف پر پہلی نظر پڑی ہے تو ایسی کیفیت ”شوقیہ“ و ”انجذابیہ“ پیدا
ہوئی کہ خود صاحب حال کا اعتراف ہے۔

”ایسی کیفیت مجھ پر عمر بھر بھی طاری نہیں ہوئی۔“ اس کیفیت کو کوئی کیا
بتائے اور کیسے بتائے۔

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکیں

شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے

(حضرت سلیمانؑ)

حج ثانی اور صحبت شیخ

عشق کی چنگاریاں جو دہی دہی سی تھیں، حضرت حاجی صاحب کے تعلق اور ارض پاک مکہ کے قیام سے بھڑک اٹھی تھیں لیکن اب بھی ان میں سوختہ سامانی کی کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی حج سے واپس ہو کر کانپور میں درس و تدریس کا سلسلہ اور تحریر و تقریر کے مشاغل برابر جاری رہے، بیسیوں کو عالم بنایا اور سینکڑوں ہزاروں کے دل میں دین کی عظمت بٹھائی اور اس کا سکہ جمایا، ادھر شیخ عالی مقام سے خط و کتابت کے ذریعہ سلوک کی منزلیں طے ہوتی رہیں اور مقامات حاصل ہوتے گئے۔ اندر ہی اندر عشق الہی کی آگ بھڑک رہی تھی کہ ایسے میں ایک تفتہ جان حیدر آ باد دکن سے کانپور آئے۔ پیر جی امداد علی صاحب جن کا ذکر ابتدائی اوراق میں آچکا اور جو مولانا کے ماموں تھے ان کے جذبہ عشق و ترک دنیا نے آپ کے جذبہ کو بے قابو کر دیا۔ جو چیز اب تک چھپی تھی ظاہر ہو چلی ہے

المدد توفیق ضبط والمدد تاب سکوت

لب پہ لے آئے نہ جوش دل کہیں اسرار دل (حضرت سید کا)

شیخ تو تھے سمندر پار اور ادھر حالت ہو رہی تھی بے قابو، فوراً حضرت

گنگوہی کی خدمت میں اپنا حال ظاہر کر دیا اور احتیاطاً عربی میں لکھواتا کہ
 کسی غیر کی نظر پر ٹھہری جائے تو بات چھیڑے۔ دل پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی۔ جبکہ
 آج بھی الفاظ پڑھ کر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
 اس خط کے چند جملے سنئے:

فيا مولنا دل الله انى كنت فى ذالك الزمان غريقا فى بحار
 الحيوۃ والطلب اطلع الى من يخلصنى من ذاك الوصب النصب۔
 اذ فادى منادى من قريب من غير اراوتى وقصدى هات يدك
 بيدى انجيك من هذا البحر اللجى۔ وان الغريق يتشبت بكل
 حشيش لما هو فيه من التهويش والتشويش وقد كنت من وراء
 البحار من حليبي ومغيشى وطيبى ومع هذا ما تركت بحمد الله
 يوما العمل بقول الاكابر خذ ما صفا وخر ما كاد

ترجمہ: اے مولانا خدا کی قسم میں اس زمانہ میں حیرت و جستجو کے سمندر
 میں غرق تھا اور ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا تھا جو مجھے اس تکلیف اور
 پریشانی سے نجات دلائے یکا یک بغیر میرے قصد و ارادہ کے ایک
 منادی نے مجھے آواز دی کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے
 میں تجھ کو اس بحرِ ذخار سے نجات دلاؤں گا۔ چونکہ ڈوبتا تنکے کا
 سہارا ڈھونڈتا ہے۔ کیونکہ وہ پریشان و مشوش ہوتا ہے۔ اور میں تو
 اپنے حبیب و دستگیر اور اپنے طبیب سے اس طرح بچھڑا ہوا تھا

کہ ہم ہیں سمندر حائل تھے۔ اس لئے میں نے اس منہ دی کی آواز پر لبیک
کہی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، لیکن اس کے باوجود بحمد اللہ میں نے
ایک دن بھی اکابر کے اس قول پر عمل کو نہ چھوڑا کہ ”خذ ما صفا دے ماکہ“
جو اچھائی ہو لے لو اور برائی کو چھوڑ دو۔“

ان احوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ۱۳۰۷ھ سے زندگی نے دوسرا پلٹا کھایا۔
باطنی شغل سے چسپی اس درجہ بڑھ گئی کہ سارے تعلقات سے دل سرد ہو گیا، اپنے
شیخ عالی مقام سے ترک ملازمت کا مشورہ لیا مگر جواب آیا:

نامہ بہجت شمامہ آن عزیز باتمیز رسید، انما سماع حال ذوق و شوق
آثار تری فہمید، مسرت بر معشرت افزود، حق تعالیٰ برکت زیادہ کند
بہ خلق اللہ فیض دینی رسانیدن راہ قرب وصول الی اللہ است۔

(مکتوب ۲۲ م ۱۳۰۷ھ)

جو لوگ حضرات چشتیہ پر قرآن و سنت سے دوری اور شریعت سے گریز
کا اتہام باندھتے ہیں وہ سلسلہ چشت کے اس برگزیدہ شیخ کے خط کشیدہ الفاظ کو
ذرا غور سے پڑھیں اور اس قسم کی بے سرو پا باتوں سے اپنی عاقبت برباد نہ کریں۔
مرشد برحق کے اس ارشاد کو آپ نے سرا نکھوں پر رکھا اور ۱۳۱۰ھ
تک ضبط و سکون کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہے، لیکن اب شوق
اضطراب نے بیدار کر دیا اور شیخ عالی مقام کا ارشاد بار بار یاد آنے لگا
کہ میاں اشرف علی، تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ، کسی پہلو چپ نہ آتا تھا۔

آخر لا وہ کر لیا، اسباب مہیا ہو گئے، والد ماجد اس وقت تک انتقال فرما چکے تھے، شاگردوں اور دوستوں کو چھوڑ چھاڑ کر چل نکلے۔

تو باش اینجا و باخا صان ہیا میز

کہ من دارم ہوائے منزل دوست

حضرت حاجی صاحب تو چاہتے ہی تھے کہ چھ مہینے کے لئے یہ مرید رشید

آجائے۔ اب اس خواہش کو پورا ہوتا دیکھ کر اس درجہ مسرور ہوئے گویا یعقوب

کو یوسف گم گشتہ مل گیا، عنایات و لطافت اس قدر بڑھ گئے کہ اوروں کو حسد ہوئے

اور بعض تو آپ کے درپے آزار بھی ہو گئے۔

بہر کیف ادھر قوت فیضان کا وہ حال اور ادھر کسب فیض کی صلاحیت کا

یہ عالم کچھ ہی عرصہ میں شاگرد و استاد، مرید و پیر ہم رنگ ہو گئے۔ خود حضرت شیخ

بے ساختہ فرماتے لگے۔

”بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔“

جب اپنے مرید باکمال کی کوئی تحریر نظر سے گذرتی یا تقریر سننے میں آتی تو

بے اختیار زبان شیخ کہہ اٹھتی

”جزاکم اللہ تم نے تو بس میرے سینہ کی شرح کر دی“

پھر کیا عجب ہے کہ جب کوئی حضرت حاجی صاحب سے علم و عرفان کی کوئی

بات پوچھتا تو آپ اپنے مرید اشرف ہی کی طرف اشارہ کرتے اور فرماتے۔

”ان سے پوچھ لو، یہ خوب سمجھ گئے ہیں۔“

شیخ و مرید میں باطنی مناسبت، جو اصلی مناسبت ہے، پیدا ہو ہی چکی تھی۔ لیکن خاطر شیخ میں ظاہری مناسبت کی تمنا بھی پنہاں تھی۔ حکیم الامت کے اسی دورانِ قیام مکہ میں آپ کی اہلیہ محترمہ اور خالہ صاحبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں؟ خالہ صاحبہ نے خدمت شیخ میں عرض کی۔

”ان کے لئے صاحبِ اولاد ہونی کی دعا فرمائیے۔“

حضرت نے ان کی درخواست تو مان لی۔ لیکن باہر آ کر اپنے مرید عزیز سے فرمانے لگے۔

”تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لئے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہو سو دعا تو میں نے کر دی لیکن بھائی میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم بھی رہو، جو حالت میری ہے وہی حالت تمہاری بھی ہے۔“
مرید با تمیز نے پوری بشاشت سے عرض کی۔

”جو حالت حضرت کو پسند ہے، وہی میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔“

یہ جواب پا کر حضرت حاجی صاحب بڑے مسرور ہوئے کہ ہر اعتبار سے اپنا جانشین مل گیا۔ اسی ایک بات سے اس خصوصی محبت و شفقت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو شیخ کو اپنے مرید سے تھی، ہر طرحِ دل و جان سے یہی چاہتے تھے کہ اشرف علی ”امداد اللہ ثانی“ بن جائیں اور کبھی فرق نہ ہو سکے کہ من و دیگر تو دیگری۔ یہ اختصاص کسی اور مرید کے حصہ میں نہیں آیا!

ایک صاحبِ علم مولوی محمد حسن صاحب کو مکہ معظمہ میں مسئلہ

وحدۃ الوجود کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ یہ تو بالکل خلاف ایمان معلوم ہوتا ہے^۱
 حکیم الامت نے ان کے اس اشکال کو رفع کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ اس مسئلہ
 کے بغیر ایمان کامل ہی نہیں ہوتا۔ ان کو آپ کی تقریر سے اس درجہ تشفی ہوئی کہ
 خوش ہو کر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں یہ واقعہ نقل فرمایا،
 حضرت شیخ فرط مسرت سے کہہ اٹھے۔

”ہاں جی ہاں۔ ان پر یہ مسئلہ خوب منکشف ہوا ہے“

اب بھی بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ
 مسئلہ کی حقیقت سے بے خبری۔ اور اس کی غلط تشریحات ہیں۔ (مؤلف)
 وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود ظاہر ہے کہ تمام کمالات حقیقۃً
 اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں اور مخلوقات کے کمالات عارضی طور پر ہیں
 کہ اللہ تعالیٰ کی عطا و حفاظت کے سبب ان میں موجود ہیں، ایسے وجود کو
 اصطلاح میں وجودِ ظلی کہتے ہیں اور ظل کے معنی سائے کے ہیں سو سائے
 سے یہ نہ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی جسم ہے اور یہ عالم اس کا سا
 ہے۔ بلکہ سائے کے وہ معنی ہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ ہم آپ کے زیر سایہ
 رہا کرتے ہیں یعنی آپ کی حمایت و پناہ میں، اور ہمارا امن و عافیت
 آپ کی توجہ کی بدولت ہے۔ اس طرح چونکہ ہمارا وجود بدولتِ عنایت
 خداوندی ہے اس لئے اس کو وجودِ ظلی کہتے ہیں۔ پس یہ بات یقیناً ثابت
 (باقی صفحہ ۷۰ پر)

اس مرتبہ کے قیام مکہ معظمہ میں حکیم الامت پر "توحید" کا انکشاف
 بدرجہ اتم ہوا، جو شریعت و طریقت کی اساس اور درویشی و تصوف کا حاصل
 ہے اور جس کا لازمی نتیجہ "عبدیت" ہے جو سلوک کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ سارے
 انبیاء اسی مقام سے بدرجہ کمال، ممتاز رہے ہیں اور ہمارے حضور انور صلی اللہ
 علیہ وسلم پر تو اس مقام کا کمال "ختم" ہے اور یہی آپ کا طرہ امتیاز ہے۔ چنانچہ

(بقیہ صفحہ ۷۱) ہوتی کہ ممکنات کا وجود حقیقی اور اصلی نہیں ہے عارضی اور ظلی ہے

اب وجود ظلی کا اگر اعتبار نہ کیا جائے تو صرف وجود حقیقی کا ثبوت ہوگا اور
 وجود کو واحد سمجھا جائیگا یہ وحدۃ الوجود ہے اگر اس کا بھی اعتبار کیجئے
 کہ آخر کچھ تو ہے بالکل معدوم تو ہے نہیں گو غلبہ نور حقیقی سے کسی متفاوہ
 سالک کو وہ نظر نہ آئے تو یہ وحدۃ الشہود ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ نور
 جہتاب نور آفتاب سے حاصل ہے اگر اس نور ظلی کا اعتبار نہ کیجئے تو صرف آفتاب
 کو منور اور جہتاب کو تاریک کہا جائے گا۔ یہ مثال وحدۃ الوجود کی ہے۔
 اور اگر اس کا نور بھی اعتبار کیجئے کہ آخر اس کے کچھ تو آثار خاصہ ہیں گو وقت
 ظہور نور آفتاب کے وہ بالکل مسلوب النور ہو جائے یہ مثال وحدۃ الشہود
 کی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہے۔ مال کا
 دونوں کا ایک ہے۔ اور چونکہ اصل و ظل میں نہایت قوی تعلق ہوتا ہے
 اس کو اصطلاح صوفیہ میں "عینیت" سے تعبیر کرتے ہیں اور عینیت کے
 یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے، یہ تو صریح کفر ہے۔ چنانچہ وہی

دبانی صفحہ ۷۱ پر

پورے کلام پاک میں محض "عبد" کا لفظ کہہ کر اگر کسی کی ذات مراد لی گئی ہے تو وہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ سبحان الذی لا یؤثر فیہ "بعبدہ" لیل من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (پاک ہے وہ ذات جو اپنے "عبد" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو رات کے ایک حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔

غرض تقریباً ۶ مہینے کے قیام کے بعد حکیم الامت نے اپنے شیخ عالی مرتبت سے رخصت چاہی۔ عارف باللہ حضرت حاجی صاحبؒ نے دو وصیتیں بطور خاص فرمائیں۔

(۱) دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت نہ کرنا!!

(۲) کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا توکل بخدا تھا نہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔

(بقیہ صفحہ ۷۲) صوفیائے محققین اس عینیت کے ساتھ خیریت کے بھی قائل ہیں۔ پس یہ

عینیت اصطلاحی ہے نہ کہ لغوی۔

مسئلہ کی تحقیق تو اسی قدر ہے، اس سے زیادہ اگر کسی کے کلام

منشور یا منظوم میں پایا جائے تو وہ کلام حالت سُکر کا ہے اور نہ

قابل ملامت ہے نہ لائق تقلید!! (تعلیم الدین از حکیم الامت)

گویا ۱۳۰۸ھ میں جس ترک تعلق کو منع فرمایا تھا اب بعد حصول "تمکین"
خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں۔

غرض ان وصیتوں اور باطنی دوستوں کو لے کر آپ ۱۳۱۱ھ مالامال
ہندوستان لوٹ آئے۔

ایک واقعہ یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اشرف السوانح
میں درج نہیں لیکن خود حضرت تھانویؒ کے بعض خلفاء سے راقم نے راست
سناسے، وہ یہ کہ جب حکیم الامت کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو حضرت حاجی
صاحب قدس سرہ مراقب ہوئے اور پھر فرمایا:

"حیرت ہے قاسم و رشید سے ان کا درجہ بڑھ گیا"

حضرت مولانا تھانویؒ کی تجدیدی مساعی اور آپ کے فیض کا اطراف ہند میں
پھیلاؤ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ارشاد کی کھلی دلیل ہے!

واللہ یختص برحمۃ من یشاء

۱۔ یعنی مولانا محمد قاسم صاحب تانوی بانی دارالعلوم دیوبند اور مولانا

رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہم اللہ جن کے متعلق حضرت حاجی صاحب فرمایا

کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لائے ہو تو میں قاسم و رشید کو پیش کر دوں گا۔

واپسی اور قیام وطن

مکہ معظمہ گئے تھے اس حالت میں کہ نوجوانی تھی، خداداد جمال و جلال ایسا کہ طالب علمانہ سادگی کے باوجود ہر نظر میں سماتے اور ہر دل میں اتر جاتے تھے مگر شش ماہ قیام کے بعد جب لوٹے ہیں تو عشق کے ہاتھوں وہی حال ہو چکا تھا، جس کا خاکہ زمانہ طالب علمی میں خود ہی کھینچ چکے تھے۔

عشق می ساز و زمال و جاں جدا	عاشقاں را نیست مطلب جز خدا
عشق، عاشق را کند زار و نزار	عشق، عاشق را کند سوا و غار
عشق ساز و زرد روی عاشقاں	ہم کند دلیدہ موئے عاشقاں
عشق معشوق است مرعشاں را	من اہوب العشق ہم تا لوبی

(مثنوی زیر و بم)

کانپور میں ۱۳۱۵ھ تک قیام
ہندوستان پہنچ کر پھر مدد
جامع العلوم کانپور کی خدمت میں
مشغول ہو گئے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ پھر کیفیت "شوقیہ الہیہ" نہایت جوش و
خروش سے وارد ہوئی، مگر اس واقعہ اس میں کلفت کے بجائے لذت اور ناگواری کے
بدلے خوشگواری تھی۔ شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل کی کیفیت شوقیہ

”سیر الی اللہ“ کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت ”سیر فی اللہ“ کے باعث تھی۔ وہ حالت
 مشاہدہ سے پہلے کی تھی اور یہ اس کے بعد کی، وہ ”اثر عشق“ تھا اور یہ ”اثر حسن“ یا خود ہی
 فرماتے تھے: ”جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذکر و شغل اور ولی کامل بنا دوں۔“ چنانچہ
 اسی غلبہ حل کی وجہ سے شروع شروع ”حلقہ توجہ“ بھی منعقد فرماتے تھے۔ تاکہ اپنا ”ایقان
 مریدوں میں بھی جلد از جلد پیدا ہو جائے۔ اس زمانہ میں اثر کا یہ عالم تھا کہ توجہ لینے
 والے تاب نہ لاسکتے تھے اور بے قابو ہو جاتے تھے، اس کی وجہ سے مدرسہ مدرسہ ہی
 نہ رہا تھا بلکہ خالقہ بھی بن گیا تھا۔ سارے طلبہ و استاذہ ذکر و شغل سے مرست و مہر شاد
 تھے۔ اس کی اطلاع جب حضرت شیخ کو ہوئی تو جواب آیا:

”ما شاء اللہ آپ اور آپ کے متعلقین کے ذوق و شوق کی کیفیت سن کر
 طبیعت نہایت ہی خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بائیں ہمہ ذکر و شغل و اکمل مشغول
 رکھے، دن بدن ترقی در ترقی عطا فرمائے، مقصود اصلی تک پہنچائے
 آمین ثم آمین

۱۔ حکیم الامت نے ابتداءً غلبہ ذوق و شوق میں حلقہ توجہ بھی منعقد کیا تھا
 لیکن بعد میں اس کو اپنے مشرب سے الگ قرار دیدیا۔

۲۔ ذوق و شوق مقصود اصلی نہیں: ذوق مطلوب نہیں کیونکہ وہ
 ایک حال ہے نہ کہ مقام، اور مقام مطلوب ہیں نہ کہ احوال اور فرق
 دونوں میں اختیاری و غیر اختیاری ہونے کا ہے۔ اہل فن کا قول ہے:

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

لیکن اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ تو ایک حال تھا اور حال کو قرار کہاں! ع
 "گاہ ہست و گاہ نیست"

چنانچہ جب مقامات^۱ میں رسوخ بڑھتا گیا تو اس شوقیے نے اور ہی رنگ اختیار
 کیا۔ نظر بلند تر مقامات پر پڑنے لگی۔ اور ان کے حصول کی تڑپ پیدا ہوئی اور اس نے
 اضطراب و التہاب کی ایک کیفیت پیدا کر دی جیسی قیام مکہ سے پہلے ہوئی تھی۔ لیکن دلوں
 کی اصل میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اس دفعہ کی کیفیت "طلب ابتدائی" کا نتیجہ تھی۔

بقیہ صفحہ ۷۶

"امقدمات مکاسب و الاحوال مواہب" حضرت حاجی صاحب فرمایا
 کرتے تھے کہ طالب لذت طالب حق نہیں ہے کام میں لگنا چاہیے، ثمرہ پر نظر
 نہ چاہیے اسی طرح شوقِ مطلوب نہیں عملِ مطلوب ہے بلکہ عمل بلا شوق
 میں زیادہ تعب کے باعث زیادہ اجر ہے، اور یہ نکتہ عمر بھر ملے میں باندھ
 لینے کے لائق ہے۔ مقصد اصلی طلبِ رضائے الہی ہے۔ جب مسلمان کو
 خدائے تعالیٰ سے محبت اور عشق ہے تو بس اس کو اس کی کوشش کرنی چاہیے
 کہ حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو چاہے اس میں اپنا یاد و سرے کا نقصان ہی کیوں
 نہ ہو۔ بس رضائے حق کی تلاش کرو جب رضائے الہی تو رضائے (یعنی ظاہر و باطن)
 بھی مل جائے گی، لیکن رضائے الہی کی نیت سے رضا کو مت طلب کرو۔ رضائے الہی
 تو خیر نہ ملے تو ٹھٹھ کر مر جاؤ کیونکہ جیسے رضائے تمہاری نہیں بلکہ ان کی عطیہ
 ہے ایسے ہی جان بھی تمہاری نہیں ہے۔ غرض اپنی طرف سے اسی کے لئے
 باقی صفحہ ۷۶ پر

اور موجودہ حالت "طلب مزید" کا۔ اسی لئے اب کی حیرانی و پریشانی بھی سخت تر لاحق ہوئی!

یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیش گوئی حضرت شیخ نے اپنے مرید کو واپس کرتے وقت فرمائی تھی،

سارے مشاغل سے دل سرور ہو گیا، کہاں کا درس اور کیسا وعظ؟۔ اہل کا پیور جو آپ کے مواعظ کے دلدادہ تھے، بیتاب ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایک بڑا جلسہ تھا، بیرونی علماء بھی آئے ہوئے تھے اراکین مدرسہ ان علماء کو لیکر آپ کی خدمت میں آئے اور وعظ گوئی کے لئے اصرار کیا۔ اکابر علماء و دیکھ کر نہ انکار بن بیٹھا تھا نہ اپنی حالت کے پیش نظر اقرار ممکن تھا جب کچھ نہ بن آیا تو گردن جھکائے آنسوؤں کی زبانی اپنا حال دل سناتے لگے۔

بقیہ صفحہ ۷۷

آمادہ ہو، باقی عبادۃ اللہ یہی ہے کہ رضائے ساتھ رضائی بھی ملتی ہے۔

(مواعظ حکیم الامت)

دعاشیہ صفحہ ۷۵

حال اور مقام: سالک کے قلب پر جو کیفیت غیب سے نازل ہو جس پر

اس کا کچھ اختیار نہیں اس کو "حال" کہتے ہیں اور جس مرتبہ سلوک میں اس نے

پختگی و استقامت حاصل کی ہو وہ "مقام" ہے پس "مقام" تو سالک کے

تحت میں ہوتا ہے اور "حال" کے تحت میں سالک ہوتا ہے۔

(تعلیم الدین حکیم الامت)

یہ دیکھ کر مولانا ظہور الاسلام فتح پوری کا دل گچھل گیا اور بے ساختہ
ان کی زبان سے یہ شعر نکلا

عشق نے عناللب نغمہ کر دیا
در نہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
پھر اپنے ساتھیوں سے فرمایا "بس بھائی بس اب انہیں اپنے حال پر چھوڑو
تنگ نہ کرو۔"

اسی طرح ایک اور موقع پر شاہ سلیمان صاحب پھلواری تشریف لائے
ہوئے تھے، ان سے بھی کانپور والوں نے عرض کی کہ وہ حکیم الامت "گولب کشانی
ہم آمادہ کریں تو انہوں نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا:
"اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوا یا تو بس ممبر پر بیٹھتے
ہی اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ "اتالی حق" ہو گا ایسی حالت
میں اصرار نہ کرنا مناسب نہیں۔"

ان کی اس رائے کی تصدیق بعد کو خود حکیم الامت نے بھی فرمائی کہ اس
زمانہ میں مجھ پر توجید کا بہت غلبہ تھا۔ اس لئے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا
تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے اور عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے۔
دیکھئے کہ اس غلبہ حال میں بھی مصلحت عامہ کا خیال کس قدر عجیب و
نایاب ہے! یہ اسی ہستی سے ممکن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح امت کے لئے
جن لیا ہو!!

غرض یہ کیفیت التہاب بڑھتی چلی گئی، پیر جی امداد علی صاحب ابھی کانپور
 ہی میں مقیم تھے۔ اور ماموں ہونے کی وجہ سے ان سے ربط قائم ہی تھا، اس
 حالت میں کچھ ان سے چارہ جوئی بھی کی، لیکن ظاہر ہے کہ "طریق مصطفوی" صلی اللہ
 علیہ وسلم کے چلنے والے کی کیفیات و احوال کو ایک ایسا شخص کیا جان سکے، جو
 نئے و ربط کی پریچ وادیوں سے گھوم گھوم کر کسی مقام تک پہنچا ہو!!

نتیجہ یہ کہ پیر جی صاحب کی ہر تدبیر بے فائدہ اور ان کی ہر دوائے نتیجہ
 نہیں بلکہ مرض کی زیادتی کا باعث ہوئی اور حالت بے قابو ہونے لگی۔ اتفاقاً
 کوئی صاحب مکہ معظمہ جا رہے تھے حکیم الامت نے ان کے ذریعہ اپنے پورے
 احوال لکھ بھیجے اور گویا اس کا بھی اعتراف کیا کہ

چند اں کہ گفتیم غم باطیبیاں
 درمان نہ کردند مسکین غریباں
 با حال خود را بایار گفتیم
 نتون نہفتن درد از حبیبیاں

جب یہ عریفہ شیخ العرب و العجم کی خدمت میں پہنچا تو آپ کا یہ عالم
 تھا کہ کبھی گھر میں تشریف لے جاتے اور کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے
 "جو ان آدمی ہیں غلبہ ہو گیا ہے تحمل نہیں ہو سکا، مگر میں تو اتنی دور
 ہوں کیا کروں؟"

اس پر جو صاحب عریفہ لے گئے تھے انہوں نے کہا: حضرت میں جلدی

جائے والا ہوں۔“

بس یہ سن کر خاطر شیخ میں سکون و سرور کی لہر دوڑ گئی، جواب ان کے حوالے کر دیا اور فرمایا:

”ان سے کہنا کہ جب تک تمہارا خادم زندہ ہے کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو۔“

جب یہ صاحب ہندوستان لوٹ آئے اور حکیم الامت کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو عین دوپہر کے وقت مشتاقانہ ان کے گھر پہنچے، انہوں نے والا نامہ حوالے کیا اور زہ بانی پیام بھی۔ اس سے جواثر ہوا اس کا حال زبان اشرف سے سنئے۔

”قبل ظہر انہوں نے مجھے حضرت کا یہ پیغام سنایا تھا۔ بس سنئے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دھکتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی اور جلتے ہوئے سینے پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو عصر تک نصف سے بھی کم پریشانی رہ گئی اور مغرب تک تو بس مطلع بالکل صاف تھا۔“

سر بسر شوق“ وہمہ در وہماری تحریر

سر بسر پایہ“ لتکین“ ہے تمہارا مکتوب

(حضرت سیدی مدظلہ)

غرض یوں شوق کی کیفیت ”انس“ میں بدل گئی اور جس طرح اس مرتبہ کی

کیفیت شوقیہ پہلے سے بہت اعلیٰ تھی، اسی طرح یہ کیفیت ”انس“ بھی گذشتہ کیفیت سے کہیں ارفع تھی۔ اصل یہ ہے کہ راہ سلوک ایک سیدھی مگر ہموار و سطح نہیں بلکہ نشیب و فراز کی راہ ہے، اس میں اتار چڑھاؤ مسلسل چلا جاتا ہے مگر اس کا ہر اتار کچھلے چڑھاؤ سے بہتر اور ہر چڑھاؤ کچھلے اتار سے اس لئے اہم تر ہے کہ منزل مقصود سے قرب ہوتا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ ”از حق انس گیر داز خلق وحشت گیر“ چنانچہ رفتہ رفتہ آپ کو بھی تعلقات سے وحشت ہونے لگی، یہاں تک کہ کانپور جیسے پسندیدہ مقام سے اور اپنے قائم کردہ مدرسہ سے بھی برداشتہ خاطر ہو گئے۔ حضرت شیخ کی نصیحت یاد آئی کہ اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر توکل بخدا تھانہ بھون ہی میں جا کر بیٹھ جانا۔

۱۳۱۳ھ کے ختم پر اب ٹھان لی کہ خالقہ تھانہ بھون کو، جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ حضرت حافظ ضامن شہیدؒ اور حضرت شیخ محمد صاحب محدث تھانویؒ کی برکات سے ”وکان معرفت“ کہلاتی تھی اپنا گوشہ عاقبت بنایا جائے۔ مگر کانپور کے فریفتہ و گردیدہ لوگوں سے بے مروتی بھی کیسے گوارا ہو سکتی تھی اپنی خداداد فراست سے اس گتھی کو سلجھا لیا۔ اتفاقاً ان دنوں مدرسہ کی مالی حالت کچھ خراب تھی اس بہانہ سے پہلے اپنی تنخواہ سے دست بردار ہوئے پھر اپنی جگہ مولوی اسحق صاحب بردوانیؒ کو مدرسہ اول بنایا۔ اور اپنے لئے محض سرپرستی کی خدمت رکھ لی، اس کے بعد اہل کانپور سے کچھ دن

آرام لینے کا عذر کر کے آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں خوش خوش کانپور سے چل نکلے اور
تھانہ بھون آکر اس کی اطلاع حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچائی جواب آیا۔

”بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے، امید ہے کہ آپ سے
خلایق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسہ کو از سر نو
آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے“

(مکتوب ۳۶ م ۱۲، ربیع ۲ ۱۳۱۵ھ)

یہاں رہ کر حضرت مولانا تھانوی وقتاً فوقتاً مدرسہ کانپور کے حالات
دریافت فرماتے رہے تاکہ اہل کانپور یہ نہ سمجھنے لگیں کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے
ترک تعلق فرمایا ہے مگر جب اطمینان ہو گیا کہ اب مدرسہ کی مشین ٹھیک پہنچ رہی
چل رہی ہے اور اب اپنے عزم کے اظہار سے اس میں خلل کا اندیشہ نہیں رہا،
تو مدرسہ والوں کو لکھ بھیجا کہ

”انقل و قال مدرسہ حالے ولم گرفت

یکچند نیز خدمت معشوق می کنم“

اہل کانپور کے دلوں پر یہ خبر برق بنکر گری، ان لوگوں نے درخواست
کی کہ مدرسہ کا کوئی کام حضرت کے ذمہ نہ ہوگا۔ لیکن قیام تو کانپور ہی میں رہے
آپ نے جواب میں اصل حقیقت ظاہر کر دی کہ جو کچھ کیا گیا وہ مرشد عالی مقام
کے حکم سے تھا۔ ان لوگوں نے حضرت حاجی صاحب سے آپ کے قیام کانپور کی
اجازت چاہی، لیکن حضرت قدس سرہ نے ان کو اور خود حکیم الامت کو یہی لکھ

بھیجا:

” فقر کے نزدیک مستقل قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے باقی
تعطیل وغیرہ کسی فرصت میں یا جس وقت طبیعت کچھ گھبرائے تو
کانپور کا دورہ بھی کریں اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں۔ اور
طالب کے لئے تو تھانہ بھون کا پورے سے کچھ دور نہیں۔“

۱۳۱۵ء سے مستقل قیام تھانہ بھون شروع ہوتا ہے جو تا آخر حیات باقی
رہا۔ یعنی مستقل قیام تھانہ بھون۔ آپ اس معرفت گاہ میں پہنچے جس کی رونق
مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانویؒ کی رحلت، حضرت حافظ ضامنؒ کی
شہادت اور حضرت حاجی صاحبؒ کی ہجرت کی وجہ سے ماند پڑ چکی تھی، پھر
باعث فروغ رونق ہوئے، کانپور چھوٹا اپنے قائم کردہ مدرسہ سے تعلق نہ رکھتا
والد ماجد کی دولت و ثروت کو مشتبہ پا کر ان کے ترکہ سے ایک حبہ بھی لینا گوارا
نہ کیا۔ بس اپنے شیخ عالی مقام کی نصیحت پر متوکلًا علی اللہ ہمہ تن مشغول بحق ہو گئے
یہ سودائے جاناں زجاں مشتعل

بہ ذکر حبیب از جہاں مشتعل

اس دوران میں کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے ابتداءً قرض
ہو گیا تو آپ نے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں دعا کے لئے تحریر کیا اور

لے شیخ محمد صاحبؒ نے طبعی موت پائی۔ حافظ ضامن صاحبؒ ۱۸۵۷ء

کے انقلاب میں فرنگ کی گولی کا نشانہ بنے اور اسی خلفشار کی بنا پر

اس زمانہ میں حضرت حاجی صاحبؒ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ (مؤلف)

حضرت گنگوہی سے بھی یہی درخواست کی، مولانا گنگوہی نے فرمایا۔
 ”کہو تو مدرسہ دیوبند میں تمہارے لئے مدرسہ کی تحریک کر دوں
 حکیم الامت نے ادب سے عرض کیا:

”میرا تو اس وقت عرض کرنے کا مقصود صرف دعلی ہے، باقی حضرت
 حاجی صاحب نے بعد ترک تعلق کانپور کسی اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی
 ممانعت فرمائی ہے۔ لیکن اگر حضرت کی یہ تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت
 حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب
 ہی نے اپنی پھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ صورت تجویز قرار دی ہے۔
 کیونکہ تجویز موخر ناسخ ہوتی ہے تجویز مقدم کی۔“

یہ سن کر مولانا گنگوہی نے فرمایا:

”ہنیں ہنیں اگر حضرت حاجی صاحب کی ممانعت ہے تو میں ہرگز
 اس کے خلاف مشورہ ہنیں دیتا میں دعا کر دوں گا اللہ تعالیٰ قرضے
 سبکدوش فرمائے۔“

اس طرح دونوں بزرگوں کی دعاؤں سے بہت جلد قرض کی ادائیگی کی صورت
 نکل آئی۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے اصلاح باطن کے کام میں مشغول رہے اور
 رفتہ رفتہ خالقہ کی رونق بڑھتی چلی گئی۔ اس دور میں آپ کا رنگ کچھ اور تھا۔
 خود سراپا سوز گداز تھے۔ اس لئے جو آتا سوختہ و گدازتہ ہو جاتا، ایک بسمل
 تیر نظر کا، کا شعر ہے۔

لگا ہوں سے بھر دی رنگ و پے میں بجلی نظر کردہ برقی تپاں ہوا ہے (مجدوب)

ایک آخری روحانی نگہانی ط
 ولایت کا کیا ذکر نبوت بھی پھولوں کی سیج پر
 نہیں ملتی جو ہر نبوت یوں تو ہر نبی میں اس کی
 پیدائش ہی سے رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ جو ہر مجاہدات و ریاضیات اور روحانی
 و جسمانی مصائب و آلام ہی سے جلا پاتا ہے اور جس کا رتبہ جتنا اعلیٰ ہوتا ہے
 اس پر ان تکالیف کا درد بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ چنانچہ سید الانبیاء
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

انشد الناس بلائاً الا نبیاء قالوا مثل

”یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ مصائب انبیاء کے کلام پر آئے ہیں۔

اور ان کے بعد پھر درجہ بدرجہ جو ان سے زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔“

اور نبی کی روحانی تکالیف کا حقیقی ادراک ایک غیر نبی سے کیا ممکن ہے

جب کہ ایک ”ولی“ کی اس قسم کی کیفیات کا ادراک بھی بلا ان مراحل سے گزرے
 محال ہے اس بات کو عقلی طور پر یوں سمجھئے دیکھئے کہ انسان کو راحت اور نفع

پر خوشی اور تکلیف و نقصان پر رنج کب ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا مدار

انسانی دماغ کی صحت و تندرستی پر ہے ورنہ کسی پاگل اور مجنوں کو اس کو تو

کسی نعمت کے ملنے کی خوشی یا اس کے نہ ملنے کا رنج نہیں ہوا کرتا، پھر غور کیجئے

کہ یہ خوشی اور یہ غم تو ان چیزوں کے متعلق ہے جو ہماری چند روزہ زندگی سے

متعلق ہیں اور جن کی بے ثباتی کا ہم کو یقین کامل ہے۔ تو جب ان فانی چیزوں کے

ملنے نہ ملنے سے محض صحتِ دماغ اور صحتِ حواس ظاہرہ کی بنا پر وہ تکلیف ہوتی ہے کہ بعض تو اس کی تاب بھی نہیں لا سکتے تو کیا عالم ہو گا اس مسرت و رنج کا جو ابدی اور لازوال دولت کے ملنے یا نہ ملنے اور اس پا بیدار و باقی زندگی میں کوئی نقص آنے یا نہ آنے کے احساس سے پیدا ہو۔ اور خود یہ احساسات کس درجہ قوی ہوں گے جو محض دماغ ہی کی نہیں بلکہ "قلب" کی صحت اور حواس باطنی کی بیداری کا نتیجہ ہوں!! اسی لئے کسی عارف کا قول ہے۔

بر دلِ سالک ہر راں غم بود!!

گر نہ باغِ دلِ خلا لے کم بود!!

حکیم انا مت بھی سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے، کتنی ہی گھاٹیوں سے اتارے گئے اور چڑھائے گئے۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو ایک اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے۔ اور اس راہ کی دشوار ترین گھاٹی سے بھی گزار دے تاکہ پھر دوسروں کی رہبری میں آپ کو حیرانی و پریشانی نہ ہو۔ ہوا یہ کہ آپ کی ٹبری اہلیہ کے خالو صاحب کو ایک مقدمہ کے سلسلہ میں دشمن کا شکاروں نے شہید کر دیا، اس کی اطلاع پا کر آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ فوراً چر تحاؤل پہنچے۔ تجہیز و تکفین کے سارے مراحل اپنے سامنے پورے کر آئے اور اس وقت بظاہر آپ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا مگر بعد دفن جب گھر لوٹے اور ستورات کے رونے کی آواز کان میں پڑی تو عجرب و غریب قلب پر ایک ایسی کاری ضرب لگی کہ اختلاج سا ہو گیا ابھی اس سے نجات بھی نہ ملی تھی کہ دو تین ہی دن کے اندر اندر گنگوہ

میں ایک اور عزیز کا انتقال ہو گیا۔ اور اس غمی میں بھی شرکت ہوئی جس سے پہلے زخم پر خوب ناک پاشی ہوئی، اسی حالت میں کچھلی رات کو نماز تہجد کے قصد سے وضو کر رہے تھے کہ یکایک بلا کسی قصد و ارادہ کے ایک "خطرہ منکرہ" وارد ہوا، چند الفاظ دفعۃً متخیلہ میں آ گئے۔ اور گویہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر اس مرتبہ اس درجہ کا شدید اثر ہوا کہ زندگی ہی سے دل سرد ہو گیا، خودکشی کے وسوسے آنے لگے خود فرماتے تھے۔

"ایک بار ایک صاحب ملنے آئے، ان کے پاس اس وقت بھری ہوئی بندوق تھی، بار بار حجبی میں آتا تھا کہ ان سے کہہ دوں کہ خدا کیلئے فیر کر کے میرے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دو۔ کیونکہ فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں۔ وہ جس بلا میں مبتلا ہیں اس سے ایمان لا کر ایک منٹ میں چھٹکارا پاسکتے ہیں اور میں جس بلا میں مبتلا ہوں اس سے ساہا سال میں بھی خلاصی ممکن نہیں؟

یہی نہیں بلکہ دو فی مصیبت یہ تھی:

"اگر ذکر کرنے بیٹھتا (جو کہ قرب کی حالت تھی) تو ساتھ ہی ساتھ وہ "خطرہ منکرہ" بھی عود کرتا اور اگر عودِ خطرہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا (جو کہ بُعد تھا) تو اس کو بھی کسی طرح دل گوارا نہ کرتا تھا، گویا یہ حالت تھی یہ

یعنی ایمانی لغاضوں کے خلاف وسوسہ جو خیال میں آ کر جم گیا تھا،

من شمع جہاں گدازم تو صبح دلکشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چورخ نمائی
نزدیک آنچنانم، دورا آنچنانکہ کفستم
نہ تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

”غرض سخت کشمکش میں مبتلا تھا اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود

صحت بدنی کے موت کو حیات پر ہزار درجہ ترجیح دیتا تھا۔“

حسن اتفاق سے یہ بات قیام گنگوہہ میں پیش آئی تھی، صبح ہوتے ہی فوراً اپنا
حال زار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے آگے رکھ دیا، جو جواب عطا
ہوا اس کی قدر و قیمت اہل فن ہی جان سکتے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد
فرمایا:

”التفات نہ کیا جائے۔“

حکیم الامت وطن نوٹ آئے لیکن حالت وہی قائم رہی بلکہ بڑھتی گئی اور
یہاں تک بڑھی کہ اختلاجِ قلب کے شدید دورے پڑنے لگے اور چند ہی دن
میں آپ بہت کمزور ہو گئے۔ حکیم محمد صدیقی صاحب گنگوہیؒ اتفاقاً تھا نہ بھٹو
آئے ہوئے تھے، ان سے رجوع کیا، حکیم صاحب نے قارورہ دیکھا تو تعجب
کیا کہ یہ زندہ کیونکر ہیں، قارورہ تو صاف بتا رہا ہے کہ حرارتِ غریزی بالکل
فنا ہو چکی ہے، اپنی ساری کوشش علاج میں لگا دی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور
ہوتا بھی کس طرح، یہ تودہ درد تھا جسکا علاج ”خزانہ غیب“ ہی سے ہو سکتا تھا۔
آپ نے پھر خانقا کا قیام ترک کر کے سفر اختیار کیا۔ عجیب کیفیت

تھی کبھی خالی بندوق لے کر فیر کرتے اور اسی میں لطف پاتے، کئی بار حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی حالت بیان کی مگر اس حکیم حاذق نے جو نسخہ روز اول بتلادیا تھا اسے بدلنے کی کوئی وجہ نہ پائی اور نہ بدلا یہی فرماتے رہے کہ خطرات کی طرف التفات نہ کرو۔ اسی اثناء میں آپ نے اپنے شیخ ذی شان کو بھی اپنے احوال سے مطلع فرمایا، جواب آیا:

”الحمد للہ آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے، یہ مقام خوف درجہ ہے اسی کو ”ہیبت اللہ“ کہتے ہیں، کبھی ”ہیبت“ اور کبھی ”نس“ کا غلبہ ہو جاتا ہے دونوں کو ایک سمجھنا چاہیے۔ فقیر دعا کرتا ہے جو کچھ قلب پر وارد ہو منجانب اللہ خیال کرو۔ جو واردات مضر ہوں گے اس مراقبہ سے سب دفع ہو جائیں گے، اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو آیا ہی کرتی ہیں انشاء اللہ سب سے پار ہو جاؤ گے۔“

مکتوبات ۴۶ تا ۴۷

پھر ایک والا نامہ میں تشفی بخشی گئی:

”آپ کی حالت اب بہت اچھی ہے، فقیر دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔“

غرض تقریباً ایک برس تک یہ ”غلبہ ہیبت“ طاری رہا۔ اور حضرت شیخ کی حیات ہی میں اس گھائی سے بھی عبور نصیب ہو گیا، اس یکسالہ مدت میں آپ پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک مرتبہ جب کسی مرید نے اپنی باطنی پریشانیوں کی تفصیل لکھ بھیجی تو آپ نے فرمایا:

جو جو مضائق و مصائب و عقبات و بلیات آپ نے لکھی ہیں یہ سو حصول
میں سے ایک حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آئے ہیں، اس وقت مجھ کو بعض
(مراد خود حکیم الامت) کے احوال یاد آگئے اور سر سے پاؤں تک اس
نے مجھ کو ہلا دیا۔

یعنی غلبہ ہیبت کے فرد ہونے کے پندرہ برس بعد بھی محض اس وقت کی یاد
نے سر سے پاؤں تک ہلا دیا تو اب سوچئے کہ عین اس حالت میں کیا کچھ نہ گذری ہوگی۔
— جس پر بتیسی ہے وہی جلنے !

اہل فن جانتے ہیں کہ اس شدید اور مدید "ہیبت" کے بعد کس قدر
لازوال اور ترقی پذیر اس "میسر آیا ہو گا اور کیسا "سوخ" و "تمکن" حاصل ہوا
ہو گا کیونکہ ہر عسر کے بعد یسر پیدا کرنا اور ہر بلا کے بعد عطا سے سرفراز کرنا
اللہ تعالیٰ کی عادت ہے۔ اور اسی لئے اس قسم کی بلائیں بھی جو پیش خیمہ عطا
ہوں، قابل قدر ہوتی ہیں اور اسی لئے شیوخ اپنے مریدوں کو اس پر مبارکباد
دیا کرتے ہیں۔

الحاصل آپ کو وہ مرتبہ ملا جس کو "عبدیت" کہتے ہیں، جس کی لازمی صفت
بندگی و سرافکندگی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ گلاب کی ایک پنکھڑی سے بوئے گل کا
اندازہ ہو سکتا ہے تو پھر ذیل میں ایک ملفوظ درج ہے اس سے حکیم الامت کی
شان عبدیت کا پتہ لگائیے فرماتے ہیں:

”بہ قسم کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سوتلی کران مسلمانوں سے
بھی جن کو لوگ بفساق و فجار سمجھتے ہیں فی الحال اور کفار سے بھی احتمالاً

فی الحال افضل نہیں سمجھتا اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے مجھے تو جنتیوں کی جنتوں میں بھی جگہ مل جائے تو اللہ کی بڑی رحمت ہو، اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوتی اور اتنی ہوس بھی بر بنائے استحقاق نہیں بلکہ اس لئے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بضرورت اصلاح زجر و توجیح کیا کرتا ہوں تو اس وقت یہ مثال میرے پیش نظر رہتی ہے کہ جیسے کسی شاہزادہ نے جرم کیا ہو اور بھنگی جلا د کو حکم شاہی ہوا ہو کہ اس شاہزادے کو درے لگائے تو کیا اس بھنگی جلا د کے دل میں ڈرے مارتے وقت کہیں یہ بھی وسوسہ ہو سکتا ہے کہ میں اس شاہزادے سے افضل ہوں؟ غرض کوئی مومن کیسا ہی بد اعمال ہو میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ فوراً یہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منہ پر کالیک دیا ہی ملے تو اس کو جاننے والا کالیک کو برا سمجھے گا لیکن اس حسین کو حسین سمجھے گا اور دل میں کہے گا کہ جب کبھی بھی صابن سے منہ دھو لے گا پھر اس کا وہی چاند سا منہ نکل آئے گا۔ غرض مجھ کو صرف فعل سے نفرت ہوتی ہے فاعل سے نہیں۔“

سارے تصوف اور ساری صوفیانہ تربیت کا حاصل یہی ہے کہ بندہ کو بندگی پر قائم رکھا جائے اور اس کے ذہن و فکر سے بڑائی و بزرگی کے ہر ضابطہ کو مٹا کر تواضع کے وصف اعلیٰ سے مزین کیا جائے۔ پس یہاں وہی صاحب کمال ہے جو عبدیت پر قائم ہے اور یہ وہ معیار ہے جو خود حق تعالیٰ کا قائم

کر رہے۔

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

(یعنی انسانوں اور جنوں کو کسی اور بات کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا)

بجز اس کے کہ وہ ہمارے غلام بنے رہیں)

یوں توجہ ثانی کے بعد کانپور ہی سے رشد و ہدایت اور

مسند ارشاد پر اصلاح باطنی کا کام شروع ہو چکا تھا اور حضرت گنگوہیؒ بھی اپنے بعض بعض مریدوں کو آپ کی خدمت میں بھیجے گئے تھے اور پھر تھانہ بھون پنچکھرا میں تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا مگر گذشتہ مرحلہ ہدایت کے تقریباً سال بھر میں یہ کام رکا رہا اور خود آپ ہی نے اس کو مصلحتاً ملتوی رکھا تھا۔ لیکن جب اس شدید اور آخری مرحلہ سے بھی حق تعالیٰ نے گزار دیا تو اب "مسند ارشاد" پر مستقلاً جلوہ فرما ہوئے اور ہمہ تن تزکیہ و تصفیہ خلق کے کام میں مشغول ہو گئے۔

محسن کا کوروی مشہور نعت گو شاعر کے فرزند مولانا، نور الحسن کا کوروی کا ایک خواب درج ذیل ہے، اس سے آپ کے منجانب اللہ مقام ارشاد پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے مجدد ہونے کی بشارت ملتی ہے۔

"میں نے سفر حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے متعلق ایک خواب دیکھا، حالانکہ اس زمانہ میں مجھ کو حضرت مولانا

لے سچے خوابوں کی بشارت ہونا حدیث سے ثابت ہے

کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی، البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا اور میرا خاندان بھی علمائے حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا، غرض حضرت مولانا کا مجھ کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید خیال بھی نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چار پائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھا تو یٰ تیمار داری فرما رہے ہیں اور ایک بزرگ دورِ سلطی ہوئے دکھائی دیئے، جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں۔ آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو کیا بیمار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بیمار ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمار داری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں، لیکن وہ بزرگ طبیب جو دورِ سلطی نظر آئے تھے وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے۔ واپسی ہندوستان پر میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ بزرگ طبیب کون تھے جو دورِ سلطی ہوئے تھے۔ حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام ہمدی علیہ السلام ہیں اور چونکہ ابھی زمانا بعید ہیں اس لئے خواب میں مکانا بعید دکھائی دیئے۔

اسی منشاء کا ایک واضح تر خواب حکیم الامت کے ایک خلیفہ مجاز حضرت

لہ اس میں تو یہی اشارہ ملتا ہے کہ شاید حضرت مولانا تھا تو یٰ اور امام ہمدی علیہ السلام کے درمیان اور کوئی مجدد پیدا نہ ہو و اللہ تعالیٰ اعلم (مؤلف)

مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مدظلہ رحال مقیم لاہور تھے دیکھا تھا وہ کبھی
درج ذیل ہے۔

”کچھ عرصہ ہوا تقریباً ۱۳۵۵ھ کا ذکر ہے، خانقاہ شریف کی مسجد کے
وسط میں بیت اللہ شریف اور حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے
روضہ پاک کو دیکھا کہ دونوں بالکل قریب قریب ہیں اور بیت اللہ
شریف غالباً حضرت والا کی سہ دری کی طرف ہے لیکن روضہ
پاک بھی بیت اللہ شریف ہی کی شکل کا ہے یعنی اس پر گنبد نہیں
ہے اور بیت اللہ شریف اور روضہ پاک دونوں پر اس قدر
سبز اور خوبصورت غلاف ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہ ہوگی اور
دونوں پر شعائیں اور انوار معلوم ہوتے ہیں، حضرت والا
بیت اللہ شریف کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اس قدر
خوش ہیں کہ ایسا ہشاش بشاش میں نے حضرت والا کو کبھی نہیں
دیکھا، نیز ایک کھجور کی ٹہنی بطور جھاڑو کے دست مبارک میں
لئے ہوئے ہیں جس کی ڈنڈی میں دستہ چھوڑ کر ادھر ادھر شاخیں
نکل رہی ہیں اور یہ ارادہ فرما رہے ہیں کہ بیت اللہ شریف اور
روضہ پاک کے ارد گرد جو غبار ہے اس کو دور فرمائیں۔“

سبحان اللہ کس وضاحت سے حکیم الامت کے مصلح امت محمدیہ اور مجدد

سنت مطہرہ ہونے کو عیاں کیا گیا ہے!

چنانچہ آپ نے تھانہ بھون کے گوشہ میں بیٹھ کر دنیا کے دوں کو ٹھکرا کر

کرمسلمانوں کی جو حقیقی خدمت انجام دی اور اس ذریعہ سے ان کے قلوب کی جو
پادشاہی حاصل کی وہ کم کسی کے نصیب میں آتی ہے۔

صرف ہندوستان کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب ہی سے نہیں بلکہ
ایران کے سبزہ زاروں، آفریقیہ کے ریگستانوں کے ساحلوں اور برطانیہ کی
تاریکیوں سے بھی روشنی کے طالب آئے اور اس شمع ضیاء پاش سے اپنی اپنی بساط بھر
روشنی لے گئے۔ وہ بھی آئے جن کی پیاس اور چشموں سے نہ بجھتی تھی اور اس دریا
پر آب نے انہیں سیراب کر دیا۔

مریدین اور معتقدین کی آمد سال کے ۱۲ مہینوں ایسی متواتر و مسلسل رہتی
تھی کہ حکومت نے اس کی وجہ سے قصبہ تھانہ بھون کو ایک مستقل ریلوے
اسٹیشن قرار دیا، اور اس "دکان معرفت" پر خریداران علم و عرفان کا وہ ہجوم
ہوا جو حضرت سلطان الاولیاء قدس سرہ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ
کے بعد تاریخ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا!

آپ کے مریدین اور معتقدین میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہزار
افراد شامل ہیں حالانکہ اس بازار میں یہ جنس ایسی ارزاں نہ تھی جیسی اور جگہ مل جاتی
ہے اس کے باوجود "مجازین" کی تعداد ۱۳۵۹ تک پہنچ گئی تھی جس میں (۷۰)
"مجازین بیعت" ہیں جن کو اصطلاح عام میں خلفاء کہا جاتا ہے۔ اور (۵۹)
"مجازین صحبت" ہیں جن کو بیعت لینے کی اجازت تو نہیں البتہ تبلیغ کی اجازت
حاصل ہے، پھر مذکورہ تشریفاء میں ہر طبقہ کے حضرات شامل ہیں۔
وہ بھی ہیں جو اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں جیسے:

خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ)
رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب مدظلہ بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ)
ہومیو پتھی وغیرہ۔

اور وہ بھی ہیں جو علم ظاہری سے زیادہ علاقہ نہیں رکھتے جیسے :
حاجی محمد عثمان خاں صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مالک کتب خانہ اشرفیہ
اور حضرت محمود الغنی صاحب سہارنپوری وغیرہ اور ساتھ ہی وہ بھی ہیں جو
اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے کامل اساتذہ ہیں۔ مثلاً (۱) سید العلماء
علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ۔

(۲) مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری نور اللہ مرقدہ سابق شیخ الجامعہ
اشرفیہ لاہور۔

(۳) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ بانی دارالعلوم کراچی۔
(۴) مولانا عبد الباقی صاحب ندوی مدظلہ سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ
عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

(۵) مولانا عبد الرحمن صاحب کیمبل پوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم
سہارنپور۔

(۶) مولانا محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند وغیرہ
حکیم الامت کو بہ شرف بھی ملا تھا کہ جس طرح حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ
کے دور میں اکثر علماء و اقیاء آپ ہی کے خوان فیض کے زلہ بردار تھے اسی طرح
اس دور کے تقریباً سارے چوٹی کے علماء اسی دریائے فیض سے سیراب

سرشار رہے۔ ع

یہ رتبہ بلند جس کو مل گیا!

اب اس عنوان کے خاتمہ پر چند خواب نقل کئے جاتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کی محبوبیت اور آپ کے طریقی کی صحت کا پتہ چلتا ہے ویسے صاحب نظر کے لئے تو کھلی کھلی علامات اتنی ہیں اور ایسی روشن ہیں کہ ان "منامیات" کی کچھ حاجت نہ تھی، تاہم چونکہ بعض لوگوں کا ذوق حدیث خواب ہی سے تسکین و تسفی پاتا ہے، اور بحمد اللہ یہاں اس کی بھی کچھ کمی نہیں، اس لئے مشے نمونہ از خروارے پیش ہے

(۱) ایک دفعہ حضور (یعنی حکیم الامت) کو احقر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ گفتگو فرما رہے ہیں اور بھی بہت سے علماء حاضر خدمت ہیں لیکن سب کی طرف سے حضور ہی کو دیکھا کہ سوال فرماتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جواب ارشاد فرماتے ہیں اور سب سے اقرب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضور ہی کو دیکھا۔
(محمد عتیق اللہ - تھانہ اسرائیل گاؤں - بنگال)

(۲) احقر کو پنجشنبہ میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور یہ دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم احقر کے والد صاحب مدظلہ کی دوکان پر تشریف فرما ہیں اور حضرت والا کی

ایک محسن کی یاد پر دو آنسو: اب کس قلم سے صاحب رویا کے والد صاحب کے نام کے ساتھ مدظلہ لکھا جائے، آہ یہ ساری بھی اٹھ چکا اب مرحوم حضرت حاجی (بابائی صفحہ ۹۷) ہیں

تصنیف کردہ کتابیں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ہیں۔“

رعبد المنان خاں دہلوی

اس روایا میں تصنیفات و تالیفات اشرفیہ کی مقبولیت کا کھلا

اشارہ ہے۔

(۳) احقر نے دیکھا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ سے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے آنحضور یعنی حکیم الامتؐ بھی اور ان کے بعد بندہ بھی غرض تینوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔“ (از کا پتور)

بقیہ صفحہ ۹۶ حاشیہ
محمد عثمان خاں صاحب دہلوی رح حکیم الامت کے خلفائے قدیم میں سے تھے۔ نوجوانی سے حضرت کے ساتھ رہتے تھے اور آخر کار خلافت سے ممتاز ہوئے۔ مرحوم کو اپنے شیخ سے اس درجہ محبت تھی کہ ساری عمر یہ معمول بنا رکھا تھا کہ دو مہینے میں تین دن ضرور شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے، جب شیخ کا وصال ہوا تو غم اس درجہ غالب رہا کہ مہینوں روتے رہے اور بصارت کے زائل ہونے کا قوی اندکان ہو گیا، ایسے میں شیخ کی رویت نصیب ہوئی دیکھا کہ گلے لگا کر ان کے شانوں پر بوسہ دے رہے ہیں اس دن سے سکون میسر آیا۔ مرحوم مولانا تھانویؒ کے مواعظ اور ان کی تصنیفات کے قدیم ناشر تھے اور ایک ماہوار رسالہ ”الانقاع“ کے ذریعہ مواعظ کی تشہیر کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آکر اس کام کو تا آخر

اس سے مسلک اشرقیہ کے عین مطابق سنت ہونے کی تصدیق ہوتی ہے
 (۴) جمعۃ الوداع کی شب کو فدوی نے ایک خواب دیکھا کہ بندہ کسی
 جگہ پر بیٹھا ہوا حلقہ کر رہا ہے۔ اور اوپر سے ایک تخت نمودار ہوا جس میں
 چار چراغ روشن تھے۔ اور چار ہی اصحاب نظر آئے۔ وہ اصحاب مجھے تخت
 پر بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے اور پھر جنگلوں کی طرف لے گئے۔ اور پھر
 سمندر بھی نظر آیا اور اس سمندر کے اوپر سے بھی وہ تخت گذر گیا، پھر
 اسی طرح منزل بہ منزل چلتے ہوئے ایک مسجد دکھائی دی۔ یہاں پر وہ

۱ بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷

حیات جاری رکھا۔

۱۔ احقر جب کراچی آیا تو نیا زمانہ نہ حاضر خدمت ہوا۔
 مرحوم کی درویشی و سادگی اور رحمت و شفقت نے بار بار کی
 حاضری پر مجبور کیا۔ اس زمانہ میں موصوف کو ریاحی تکالیف
 تھیں، احقر کے فن ہو میو پتھک سے لگاؤ کا علم ہوا تو اصرار
 سے علاج کروایا اور اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی، اس طرح عقیدت
 و شفقت کا علاقہ اور مستحکم ہوا۔ لیکن سب سے زیادہ جس وجہ
 سے مرحوم کی عنایات احقر کے شامل حال رہیں وہ سیدی و
 سید المسلمین مولانا سید سلیمان ندوی سے میری نسبت اراوت
 تھی۔ مرحوم کو حضرت سیدی سے محبت ہی نہیں عقیدت تھی
 جس کا اظہار بار بار فرماتے تھے۔ (باقی ص ۹۹ پر)

تخت ٹھہرا وہاں نماز پڑھی اور اس مسجد کی کچھلی طرف ایک نہر بھی چلتی تھی، اس نہر میں سے انہوں نے اور میں نے پانی پیا پھر وہاں سے تخت پر بیٹھ کر ایک بازار آیا وہاں سب طرح کا سامان بک رہا تھا۔ انہوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸

ایک دفعہ دہلی میں حضرت سیدی مدظلہ خود مرحوم کی دوکان پر جا کر ملے تھے اور مرحوم سے فرمایا تھا کہ ”یہ توشہ آخرت کی ملاقات ہے۔“ اس واقعہ کو مرحوم نے کتنی بار سنایا اور روتے ہوئے فرمایا کہ یہ تیرا آج تک دل میں چبھا ہوا ہے۔

مرحوم اپنے والد کی طرف سے حج بدل کا ارادہ رکھتے تھے اور پورے سامان کر چکے تھے مگر فالج کے بے درپے حملوں نے اس کو پورا ہونے نہ دیا اور آخرے رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ میں محبت و شفقت کا یہ سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔

دوران مرض میں احقر سے دو وصیتیں کی تھیں، فرمایا تھا۔ ”حالت رنج و الم میں چونکہ عزیزوں کو ہوش نہیں رہتا اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ (۱) میری نماز جنازہ کے لئے مولوی محمود لغنی صاحب (جو مرحوم کے ہم رنگ پیر بھائی اور مولانا تھا لڑی کے خلیفہ ہیں) سے عرض کریں کیونکہ ہمارے حضرت ان سے بہت محبت فرماتے تھے۔ (۲) میری قبر کہیں ایسی جگہ بنائیں کہ جلد پیروں میں روندی جا کر مٹ جائے۔“ ان وصایا پر عمل

(باقی صفحہ ۱۰۰ پر)

اس تخت کو بازار میں ٹھہرایا۔ اور ایک دوکان پر لکھا ہوا تھا۔ یہاں پر
 رشیدیہ اور اشرافیہ کتابیں مل سکتی ہیں۔ تو میں نے اسے پڑھ کر ان
 بزرگوں سے دریافت کیا کہ مجھے مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا
 اشرف علی صاحب کی کتابیں دیدو۔ انہوں نے چار کتابیں مجھے دیں
 ان سے وہ کتابیں لے کر پھر اسی تخت پر بٹھا کر رخصت ہوئے۔ پھر
 ایک سفید مکان دکھائی دیا جس پر سبز پردے پڑے تھے۔ وہاں تخت
 ٹھہرا اس کمرے کے اندر چاروں بزرگ مجھے بھی لے گئے اور اس کمرہ کی
 روشنی اس قدر تھی کہ تاب نہیں لا سکتا تھا اور نہ چراغ نہ بتی دکھائی
 دیتی تھی، وہاں پر تکیہ اور قالین بچھا ہوا تھا جس پر سرور جہاں صلی اللہ
 علیہ وسلم مع چاروں اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے موجود
 تھے۔ اور ہمارے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سفید اونٹنی کیڑے
 پہنائے جا رہے تھے، کیڑے پہننے کے بعد اسی تکیہ سے کمر لگا کر بیٹھ گئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹)

اس طرح ہوا کہ مولانا محمود الغنی صاحب کو عذر شرعی ہونے کی وجہ سے
 حکیم الامت کے بھانجے مولانا احتشام الحق صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی
 اور شہر سے بہت دور ایک گوشہ میں دو بجے رات کی تنہائی میں اس دُعا
 کے جسم کو پیوند خاک کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ عجیب بات یہ ہوئی کہ چند ہی دنوں
 بعد ایک مرتبہ بارش جو ہوئی تو قبر بے نشان تھی، مگر بعد میں درنا ہونے
 پھر مٹی ڈال کر اس کا نشان قائم کر دیا خیر مرحوم کی تمنا پوری ہو گئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور میں دروازہ کے باہر ان کے سامنے کھڑا ہوا ہوں تو پھر مجھے انہوں نے اندر بلا لیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شریف احمد ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کو بلا لو۔ یہ مولانا اشرف علی صاحب کا خادم ہے۔" میں سلام کر کے بیٹھ گیا اور مصافحہ کیا، وہاں پر ایک گلاس پانی کا آیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا اور پھر چاروں اصحاب نے پی کر مجھے بھی دیا اور میں نے بھی پیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "مولانا صاحب کی کتابوں پر عمل کرتے رہنا اور دوسروں کا کہنے سے مت رکتنا۔"

در شریف احمد ستفہ کنج پوری تحصیل و ضلع کرنل

اس روایے سے حکیم الامت کے مرتبہ عالی آپ کے سلسلہ کی صحت و مقبولیت آپ کے فیوض علمی کی حقانیت اور اس دور میں آپ کے متروکہ خزانہ علمی کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ ڈھاکہ (مشرقی بنگال) میں ایک بزرگ نے جو حکیم الامت کے شناسانہ تھے خواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ فرماتے ہیں "اشرف علی صاحب کو میرا سلام پہنچانا۔" ان بزرگ نے عرض کی حضور میں کو ان سے واقف نہیں، ارشاد ہوا "ظفر احمد کے ذریعہ" ایہ بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مدظلہ جو حکیم الامت کے حقیقی بھانجے ہیں اور ڈھاکہ ہی میں مقیم تھے ان سے واقف تھے، چنانچہ صبح کو ان بزرگ نے مولانا ظفر احمد صاحب سے واقعہ کا اظہار کیا اور مولانا نے موصوف نے اس کی

اطلاع حکیم الامت کی خدمت میں کر دی۔ جب حکیم الامت تک یہ مژدہ پہنچا ہے تو
 آپ پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور بسیا ختہ زبان سے نکل گیا کہ "وعلیک السلام
 یا نبی اللہ" اور اس کے بعد فرمایا کہ آج تو دن بھر صرف درود شریف ہی پڑھوں گا
 اور باقی سب کام بند!!

اس سے حکیم الامت کی شانِ عالی
 اور عند اللہ آپ کی مقبولیت و
 محبوبیت عیاں ہے۔



علالت و رحلت

رشد و ہدایت، وہ آفتاب جو ۱۲۸ھ میں مطلع تھا نہ بھون سے نمودار
ہوا اور ۱۳۵ھ سے دنیا میں شریعت و طریقت کے انوار پھیلاتا رہا، بالآخر ۱۳۶۲ھ
میں ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپ گیا۔

تاریخ وفات سے شاید پانچ برس پہلے ہی سے معذہ و جگر نے عاجز کر رکھا
کبھی قبض ہوتا تو ہٹنے کا نام نہ لیتا اور کبھی اسہال ہونے لگتے تو ہوتے ہی چلے
جاتے، مختلف اعضا ورم کر گئے، علاج برابر ہوتا رہا اور حق تعالیٰ کی اس امانت کی
حفاظت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی مگر تدبیر ہی تو بندہ کے اختیار میں ہے اور
ایسے ہی موقعوں پر تو اس کا اختیار اور اس کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے چنانچہ مرض
برطقتا گیا جوں جوں دوا کی "بالآخر کھوک بھی تقریباً بند ہو گئی خیف و نا تو ان اور
صاحب فراش ہو گئے۔ اکثر غنودگی کی کیفیت طاری رہنے لگی مگر جب بھی ہوش
آتا اور جتنی دیر بھی قائم رہتا اپنے عارفانہ کلمات اور حکیمانہ جوابات سے حاضرین
وغائبین کو تقریر و تحریر سے مستفیض فرماتے، انہی باتوں کو دیکھ دیکھ کر یہ عقدہ
کھلا کہ یہ غنودگی کے دورے نہ تھے بلکہ "رہودگی" و "استغراق" کی کیفیات تھیں۔
ورنہ کسی کی عقل مان سکتی ہے کہ اس درجہ کے ضعف میں بار بار کے دوروں کے

بادجو عقل و فکر کچھ بھی متاثر نہ ہو؟

مثلاً دیکھئے کہ عین اس چل چلاؤ کی حالت میں (۳۰۰) روپیہ کا ایک منی آرڈر آیا اس میں لکھا تھا:

”میں نے ایک منت مانی تھی کہ اگر کاروبار میں کامیابی ہوگی تو

تین سو روپیہ حضرت والا کی خدمت میں بھیجوں گا۔ چنانچہ حسب

مرسل خدمت ہیں، آپ مالک ہیں جہاں چاہیں صرف فرمائیں۔

اس کا جواب آپ نے اپنا نام تو ان انگلیوں سے بہ دقت تمام یہ تحریر

فرمایا

”پہلے تو تم نے لکھا ہے کہ ”آپ مالک ہیں“ بعد کو اختیار خرچ کر نیک

دیا ہے۔ اور یہ صیغہ ”تو کیل“ کا ہے۔ چوں کہ مالک بنانے اور

وکیل بنانے میں شرعاً فرق ہے، لہذا واپس کیا جاتا ہے۔“

حفظ شریعت کا ایسا خیال اور اس کا اتنا اہتمام کسی غائب دماغ سے

ممکن بھی ہے؟

بنگال سے ایک معتقد بااخلاص کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ حدیث

شریف میں ہے کہ جب نبی کی وفات کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اختیار

دیتے ہیں کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا یہ تمہید

لکھ کر اس میں لکھا تھا کہ میرے اعتقاد میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متبعین

خاص کو بھی اس اختیار خاص سے حسب استعداد حصہ ملتا ہوگا اس لئے عرض ہے

کہ ہم ناقصوں کی تربیت کے لئے حضرت والا چند روز اور اس دنیا میں

قیام منظور فرمائیں، خط کے جواب میں لکھوا دیا۔

”تم اپنے دماغ کا کسی حاذق طبیب سے علاج کراؤ۔“ پھر حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا۔ اول تو یہ ثابت نہیں کہ جو انبیاء (علیہ السلام) کو ملتا ہے اس میں اولیاء و مشائخ کو بھی حصہ ضرور ہی ملتا ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا ”اور اگر ایسا ہے بھی تو ان انبیاء نے کیا لیا؟“

(یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب ہی کو دنیا پر ترجیح دی)

اسی حالت میں آپ نے اپنے مرید رشید خواجہ عزیز الحسن صاحب رح مجذوب سے متعلق فرمایا کہ ان کا ایک شعر مجھے اس درجہ پسند آیا کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ بھی ہوتا تو اس کے عوض دے دیتا اور کھڑے ہو کر انسانیوں میں یہ شعر پڑھا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

مرض الموت کے دن گذرتے گئے، دوشنبہ ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کو صبح سے مسلسل دست آنے لگے۔ کمزوری و نقاہت نے رفع حاجت کے لئے بستر چھوڑنے کی طاقت بھی نہ رکھی تھی، لاچار بار بار کپڑے بدلے جلتے رہے خود صاحب مرض کو صفائی و طہارت، نماز و ادائی حقوق کا اہتمام تا دم آخر برابر کیا۔ اسی دوشنبہ کو بعد مغرب اپنی چھوٹی اہلیہ سے پوچھا: ”میں دو لوگوں کا ماہوار خرچ دے چکا ہوں؟“

تسلی دی گئی۔ ”ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے، آپ دے چکے ہیں بے فکر رہیں“

پھر فرمایا "آج تو ہم جا رہے ہیں۔"

اہلیہ نے عرض کی کہاں؟ — ارشاد ہوا "تم نہیں جانتیں؟" — اس کے بعد جو غشی طاری ہوئی تو سوا گھنٹہ تک طاری رہی۔ سانس تیز آواز سے چلتی رہی جب سانس اوپر آتی تو کتنی دیکھنے والیوں نے دیکھا کہ آپ کی درمیانی شہادت کی انگلی کے بیچ میں ہتھیلی کی پشت سے ایک ایسی تیز روشنی نکلتی تھی کہ چلتے ہوئے برقی قمقمے اس کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے۔ یہ روشنی سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آتی جاتی رہی اور جب وہ ختم ہوئی تو یہ بھی غائب ہو گئی۔

کیا عجب کہ جن انگلیوں سے حقائق و معارف ایک عرصہ تک معرض تحریر میں آتے رہے، یہ نور اسی کا ہو!

بہر کیف محفل دوشین کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض کے تند و تیز جھونکوں سے بچھ کر سنبھل سنبھل جاتا تھا۔ بالآخر سہ شنبہ کی شب یعنی ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی رات ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی ضوفشانی کے بعد ہمیشہ کے لئے بجھ گیا،

انا لله وانا الیہ راجعون

اس سانحہ عظیم کی اطلاع ہوا کی طرح پھیل گئی اور برق بنکر علماء و عشاق کے قلوب پر گری، صبح ہوتے ہوتے ہزاروں محبت کے مارے جو پہلے کس مسرت و جوش سے اور کن کن انگوں اور آرزوؤں کو لئے چلے آتے تھے، آج حسرت میں غرق فریادی اشکوں کے ساتھ سمٹ آئے،

تھانہ بھون کی شکین گاہ آج الم کردہ بن گئی!

سہارن پور اور دوسرے شہروں سے اسپیشل ٹرینیں آئیں اور ہزاروں
شیدائیوں کے ساتھ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا جنازہ نکلا۔ عر
"عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

عید گاہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ
میں جس کا تاریخی نام "قبرستان عشق بازاں" تھا اس عاشق بامراد کے جسم
نا سوتی کو پیوند خاک کر دیا گیا۔

سارے ملک میں کھرام مچا اور ساری بڑی بڑی درسگاہوں اور
خالقاہوں میں اس رحلت سے ادا سی چھا گئی کہ "موت العالم موت العالم"
(عالم کی موت دنیا کی موت ہے)!

ملک کے سربراہ اور وہ اخباروں اور رسالوں میں حکیم الامت کے علمی
و عملی کارناموں اور آپ کے فیوض و برکات پر متعدد مضامین نکلے!
حضرت رحمۃ اللہ کے منتسبین سے متعلق یہ بات حاجی محمد عثمان خاں صاحب
(مالک کتب خانہ اشرفیہ) کی زبانی اتھارنٹ نے سنی ہے کہ جو حضرات شریک جنازہ
تھے ان کو پھر بھی جلد آرام و سکون میسر آیا لیکن جن کو محرومی نہی ان کی آتش
فراق ایک عرصہ بعد جا کر فرو ہوئی۔

اے آتش فراق ت جانہا کباب کردہ!

اب ذیل میں وہ پراثر نظم درج کی جاتی ہے جو حضرت مولانا سید
سلیمان ندوی نے اپنے شیخ کی رحلت پر کہی ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں
رنج و الم کی گھٹاؤں میں فیوض شیخ کے بقاء کی پرامید ہوائیں چلتی ہوئی محسوس

ہوتی ہیں، طبیعت کا یہ کمالِ اعتدال حکیم الامت کے ایک خلیفہ مجاز اور ان کے
ہم رنگ و ہم مذاق ہی میں پایا جاسکتا ہے،

”رہلتِ شج“

داعِ فراق یا رُمٹا یا نہ جائے گا اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا
حرفِ دم و داعِ خدا کے سپرد ہو تا آخر حیات بھلایا نہ جائے گا

خیالِ سربالیں

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمالِ جہاں فریاد پھر یہ جمالِ نور دکھایا نہ جائے گا
گوشِ جہاں بغور سننے اس کلام کو پھر یہ کلامِ شوق سنایا نہ جائے گا
اے میکشویہ درو تہہ جام بھی پیو ترسو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا

★

اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے نقشِ دوام فیض مٹایا نہ جائے گا

۱۔ صاحبِ نظم رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی قدس سرہ کی وفات کی
ایک ہفتہ پہلے (۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء کے درمیان) حاضر خدمت تھے،
سرکارِ بھوپال کی ایک ضروری دعوت پر بھوپال جانے پر مجبور تھے۔
۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء کو صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی
باقی صفحہ ۱۰۹ پر)

پیر مغاں نہیں ہے مگر میکدہ تو ہے جاؤ سب کو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
یونہی بچھا رہے گا یہاں خوان فیض عام جب تک ہیں میہمان بڑھایا نہ جائے گا
پچا ہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ
یونہی جلا کرے گا، بجھایا نہ جائے گا

★

مرتبہ شہادت سے سرفرازی
مولانا تھانویؒ کے وصال کے بعد
کے ایک مجازے خواب میں دیکھا کہ
شیخ فرما رہے ہیں کہ مجھ کو مرتبہ ”شہادت“ ملا، یوں تو بیسیوں بشارتیں ہیں جو
اہل اخلاص کو عالم رویا میں سنائی گئی لیکن ان سب میں سے اس ایک کو یہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۰۸)

تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بائیں ہمہ ضعف قوت لیٹے ہی لیٹے
دولوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھائے اور فرمایا ”جاؤ خدا کے سپرد کیا“
اے مذکورہ موقع ہی پر حضرت سیدیؒ جب مولانا تھانویؒ کی خدمت میں
حاضر ہوئے تو حضرت نے اپنی محبت سے اپنے سر بالیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا
امر فرمایا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر غنودگی یا استغراق کا عالم بار بار
طاری ہو جاتا تھا اور آنکھیں بند فرما لیتے تھے، صاحب نظم مدظلہ اپنے
رد مال سے نگس رانی کرتے رہے، اسی عالم میں یہ خیالات ان کے دل و
دماغ میں گزرتے رہے۔ (ملاحظہ ہو مضمون موت العالم موت العالم مشمولہ یادزدہنگاں)

نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مرتبہ شہادت کی بشارت حضرت شاہ ولی اللہ محدث
 دہلوی کے ایک قول سے عین قرین عقل معلوم ہوتی ہے اور حضرت تھانوی کے عمل سے
 اس کی توثیق ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالیغہ میں جہاں امت محمدیہ کے اہل
 کمال کے تفاوت درجات کی بحث کی ہے وہاں تحریر فرماتے ہیں کہ شہید۔۔۔ لوگ
 ہیں جو سالنوں کی رہبری کے لئے معین ہوتے ہیں، ملاو اعلیٰ کی طرح کافر پر لعنت کرتے
 ہیں اور ایمان والوں سے خوش ہوتے ہیں، نیک امور کی ہدایت کرتے ہیں اور
 برے کاموں سے روکتے رہتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اسلام
 کو خالب کرتے رہتے ہیں، جب روز قیامت ہوگا تو یہی کافروں سے خصومت
 کرنے کو مستعد ہوں گے اور ان کے کفر کی شہادت دیں گے۔ یہ لوگ پیغمبر
 صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بہتر لہ اعضاء کے ہوا کرتے ہیں تاکہ جو بعثت سے
 مقصود ہو وہ ان کے ذریعہ سے تکمیل کو پہنچ جائے اسی لئے ان کو اوروں سے
 افضل جاننا اور ان کی عزت و توقیر کرنا واجب ہے۔



باب دوم

آثارِ علمیہ

۱۔ ”حکیم الامت کے آثارِ علمیہ“
 ”معارف“ صفر ۱۳۶۳ھ م فروری ۱۹۴۴ء

جامعیت آثار

”حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ان کی جامعیت ہے جو ان کے اوصاف و محامد میں سب سے اول نظر آتی ہے۔

وہ قرآن پاک کے حافظ ہیں مترجم ہیں۔ مجتہد ہیں مفسر ہیں، اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں، اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں، وہ محدث ہیں، احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ وہ فقیہ ہیں، ہزاروں فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہیں، نئے سوالوں کو حل کیا ہے، نئی چیزوں کے متعلق انتہائی احتیاطوں کے ساتھ فتوے دیتے ہیں، وہ خطیب تھے، خطبہ ماثورہ کو یکجا کیا ہے، وہ داعط تھے ان کے سینکڑوں وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہیں۔ وہ صوفی تھے تصوف کے اسرار و غوامص کو فاش کیا ہے۔ ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے، اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں، وہ ملفوظات ہیں جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچی ہے۔ وہ ایک مرشد کامل تھے، ہزاروں مسترشد و مستفیدان کے سامنے اپنے احوال

واردات پیش کرتے تھے، اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے، اور ہدایات بتاتے تھے جن کا مجموعہ "تربیۃ السالک" ہے۔ انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یکجا کیا۔ اور اس ذخیرہ سے سب کو آشتی کیا، ان کی متعدد کتابیں اس مضمون پر ہیں انہوں نے حضرات چشت کے احوال و اقوال میں بظاہر اعتراض کے قابل باتوں کی حفاظت ظاہر کی اور اس کی تاویلات کیں، ان کی کتابوں کے خلاصے، اقتباسات اور تہملات ان سے الگ ہیں جن کی ترتیب ان کے مسترشدوں نے کی ہے وہ مصلح امت تھے۔ امت کے سینکڑوں معائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح و رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کیں۔ وہ حکیم امت تھے، مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ احوال پر "حیوۃ المسلمین" اور "صیانتہ المسلمین" وغیرہ رسائل تالیف فرمائے غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم کوئی ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامت نے اپنی زبان و قلم سے نہیں فرمایا، اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں آسکتا ہے۔

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اردو عربی کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا، چنانچہ متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی اور سندھی میں شائع ہوئے۔

ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف

سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہے۔ ۱۳۵۴ھ میں ان کے ایک خادم مولوی
عبدالحق صاحب فخرپوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی
تفصیل کے پورے ۸۶ صفحات کو محیط ہے، اس کے بعد کے نو برسوں میں جو رسائل
یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد
اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی جو مطبوعات
و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات
و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں، پریں اور مطبع ہی کی برکات ہیں۔
زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے
ہیں، اس بنا پر مناسب تھا کہ صدی کے مجدد کی کرامت بھی انہی کمالات میں
جلاوہ گر ہو۔

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں، جن کی تصانیف کے
اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں، تو اوراق کی تعداد زندگی
کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام جبریل طبری۔ حافظ خطیب بغدادی امام
رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متحد نام اس سلسلہ میں لئے
جاسکتے ہیں، ہندوستان میں مولانا ابوالحسنات عبداللہ فرنگی محلی اور
نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں، اس سلسلہ
کا اخیر نام مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

مولانا کی تصانیف کے انواع
مولانا کے رسائل اور تصانیف
کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے

مگر ان میں چھوٹے چھوٹے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح میں مضامین و مقالات کہتے ہیں، داخل ہیں۔ ان میں بعض اتنے مختصر ہیں کہ صرف صفحے دو صفحے میں ہیں۔ بعض ایسے ضخیم ہیں کہ کئی کئی جلدوں میں ہیں۔

زبان بیشتر تصانیف نشر میں اور اردو زبان میں ہیں، البتہ بارہ تیرہ رسائل و کتب عربی زبان میں ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ سبق النعایات فی نسق الایات۔ النوار الوجود۔ التحلی العظیم۔ حواشی تفسیر بیان القرآن۔ تصویر المقطعات۔ التلخیصات العشر۔ مارتہ دروس۔ الخطاب۔ الماثورہ۔ وجہ المثنائی۔ سبع سیارہ۔ زیادات۔ جامع الآثار۔ تائید الحقیقہ اور تین فارسی ہیں: مثنوی زیر و بم۔ تعلقات فارسی۔ عقاید بانی کالج۔

نظم و نشر نظم میں مولانا کی تصنیف صرف یہی ایک "مثنوی زیر و بم" ہے اور یہ طالب علمی کے بعد ہی لکھی ہے۔ بظاہر اس میں ایک بیوقوف عاشق اور چالاک معشوق کا قصہ ہے۔ مگر درحقیقت یہ نفس انسانی کی بصیرت افروز حکایت ہے۔ ایک اور نظم اور درحمانی کے آخر میں ہے۔

مولانا کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر لڑک زمان تھے اور نظم کا ملکہ اور حلیقہ بھی تھا۔ مگر کبھی اس سے کام نہیں لیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے برادر گرامی قدر مولوی مسعود علی صاحب (ندوی) کو جو تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ اپنے حاضر ہونے کے قصد سے مطلع کیا اور ریاض مرحوم کا یہ مصرعہ لکھ دیا۔

تسوف اور سواعظ اکثر ہیں۔

قرآن پاک کی خدمت
اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود
اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے
اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی وہ بجائے خود ان کی ایک

حاشیہ لقیہ صفحہ نمبر ۱۱

چنانچہ حضرت سیدی نے فرمایا کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جلدوں پر
نظر ثانی کی۔ ۱ شرف علی ۲۷ محرم ۱۳۶۱ھ

تو صرف دو مسائل میں رجوع کرنا پڑا ایک تو معراج کا مسئلہ جس میں پہلے رجحان
امام ابن تیمیہ کی طرف تھا اور دوسرے غلو و فتنہ کا مسئلہ۔

نظم تو آخری ہی ہے۔ البتہ وفات سے چند ہی روز پہلے ایک شعر اور ہوا،
مشہور شاعر جگر مرادی نے اپنی ایک فارسی غزل جو خود ان کو بھی بہت پسند
تھی حکیم الامت کی خدمت میں عقیدت مندانہ لکھ بھیجی جس کا ایک مصرعہ
یہ تھا۔ ع

نہ یہ مطربے نہ یہ شاہدے، نہ یہ حال غنی خوشم!

آپ نے اس کے جواب میں لکھا۔ آپ کے اور رنگین جذبات نے میرے ایک
خشک جذبہ کو حرکت دیکر مجھ سے بھی ایک شعر کہلوا یا جس کو ایک اہل کمال
کے سامنے پیش کرنا اس لئے مناسب نہیں کہ ایک صورت دعویٰ کی سی ہے۔
لیکن بامید نفع پیش کرتا ہوں۔ گو وہ شعر رنگین نہیں مگر سنگین ہے۔
(باقی صفحہ ۱۱ پر)

علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانہ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے وہاں
جرامت اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا جن کو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہم علم الکتاب کی دعا دی تھی اور بشارت
سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس روایہ کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی
تھی اور یہ روایہ اسی کی طرف اشارہ تھا۔

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل
فرمائی بلکہ لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ و
قاری تھے۔ اور فنون و تجوید و قرأت کے بڑے ماہر، اخیر زمانہ میں پانی پت کو
قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت
حاصل ہو گئی تھی، مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد کسی
جہری نماز کا امام بنادیا، مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قرأت فرمائی کہ
قاریوں نے تعریف کی کہ صحت مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر موثر قرأت
ہیں سنی۔ ایک اور مقام پر جہاں اہل نظر موجود تھے۔ صبح کی نماز پڑھائی تو ایک
صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیروں کی کیفیت تھی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۸

”نہ یہ نظم شاعر خوش غزل نہ بہ نہ ناثر بدیل“
بغلامی شہ غزول، دیبا شتی نبی خوشم
اس شعر کو لکھ کر اس کے حاشیہ پر عربی میں یہ عبارت تحریر فرمائی۔ خاتمتہ الحجابات
و قلن احرا الحاکلات“ (یعنی سارے جذبات کا ختم کر دینے والا یہ جذبیہ ہونا چاہیے اور سارے
حالات کے بعد آخری حال یہ ہونا چاہیے) فقط (از خاتمتہ السوانح)

جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن لہجہ میں قاریوں کی ہٹاؤٹ نہ تھی اور نہ تخمین آواز کے لئے بہ تکلف اتار چڑھا ہوتا تھا۔ بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی، کہ ”ہر چہ از دل خیزد بر دل رسد۔“

۱۔ تجوید و قرأت و متعلقات قرآنی

علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے، مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۔ جمال القرآن: یہ فن تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو تریل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں، مخارج اور صفات حروف اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام و تفتیم و ترقیق، وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

۲۔ تجوید القرآن: اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

۳۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف: اوقاف قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے۔

۴۔ وجہ المثانی: اس میں قرآن شریف کی مشہور قراتوں کے اختلاف کو

قرآن پاک کی سورتوں کی ترکیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے۔ اور آخر میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔

۵۔ تنشیط الطبع فی اجراء السبع: قرأت سبع اور اس فن کے روائے کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

۶۔ زیادات علی کتب الروایات: اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں یہ ”وجہ المثنیٰ“ کے آخر میں بطور ضمیمہ ہے۔

۷۔ ذنابات لما فی الروایات: یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔

۸۔ یادگار حق القرآن: اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ ”تجوید القرآن“ کا اختصار و ضمیمہ ہے۔

۹۔ متشابہات القرآن لتراویح رمضان: قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سننے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں، ان سے بچنے کے لئے اس میں چند قواعد کلیہ یعنی کربعض آیات کے ضبط فرمائے گئے ہیں:-

۱۰۔ آداب القرآن: قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے ہدایات و تنبیہات ہیں۔

۲۔ ترجمہ و تفسیر قرآن

۱۔ ترجمہ: قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے جس سے حقیر کی

نظر میں بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے اس لئے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے، اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔ اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی ٹیڑھے کئے ہیں یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔

۲۔ تفسیر بیان القرآن :- یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے۔ جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے۔ اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں

سلیس و بامحاورہ و حتی الوسع تحت اللفظ۔ ترجمہ نیچے "ف" کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے

مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات و حقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر ”روح المعانی“ پر اعتبار فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتہً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے تمام اقدام کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں، یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دقیقہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا الفور شاہ صاحب نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا (یعنی علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا) خیال یہ ہے قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات و سورت کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں اس لئے وجہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق و وجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔

۳۔ چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت

غالب تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیوں سے بچانے میں بجاں و دل سہا
 رہتے تھے۔ اردو میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت شاہ
 رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع ہوئے تھے وہ بالکل کافی تھے۔ مگر
 نئے زمانہ میں پہلے سر سید نے بعض تفسیر اور پھر شیخ الاسلام ڈپٹی نذیر احمد
 صاحب نے اپنے اپنے ترجمے شائع کئے تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی
 کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کریں، اولین توجہ زبان کی طرف
 رکھیں اور اقوال سلف کی پروا نہ کریں اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب
 کر دیا اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے
 اپنا ترجمہ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مولانا
 نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا۔ اور اس کے اغلاط پر
 نشان دیکر ایک رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام "اصلاح
 ترجمہ دہلویہ" ہے۔

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے
 ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے
 پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے پر اعتراضات شروع کئے اور پھر
 اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے
 ایک عالم کا کیا ہوا ہے۔ لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے، کیونکہ
 مرزا صاحب خود عربی سے نا بلند تھے، بہر حال مولانا نے اس ترجمے کے
 اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام "اصلاح ترجمہ حیرت

۵۔ بعض معاصر علماء نے اردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے، اور آیات کو بہ تاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے، اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے، مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھیں جن کا نام ”التقصیر فی التفسیر“ ہے۔

۶۔ لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں ”تفصیل البیان فی مقاصد القرآن“ کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کے مؤلف کی درخواست پر اس میں جو غرضی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے ”الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان“ کے نام سے ظاہر فرمائے۔

۷۔ مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا، اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو ضبط تحریر میں کر لیا تھا، وہ ایک مجموعہ ہو گیا اور اس کا نام ”تفسیر بعض البينات فی تفسیر بعض الآيات“ رکھا مگر چھپا نہیں۔

۸۔ ”رفع البناء فی رفع السماء“؛ ”الذی یجعل لکم الارض فراشا والسماء جناحاً“ کی تفسیر جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کہا فائدہ ہے۔ یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے۔

۹۔ احسن الاثبات فی نظر الثانی فی تفسیر المقاصد الثالث؛

سورہ بقرہ کی تین آیتوں پر نظر ثانی فرمائی ہے۔

۱۰۔ اعمال قرآنی ”قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے

تجربہ میں آئے ان کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۱۔ "خواص قرآنی" اس کا موضوع بھی وہی ہے اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام "آثار تبیانی" ہے، ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز غیر شرعی تعویذ گندہ اور عملیات سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف ملتفت کرنا ہے اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

۳۔ علوم القرآن

علوم القرآن کے مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصانیف و مواعظ، ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو خاصی ضخیم کتاب ہو جائے۔ مگر ان پرستقل طور پر بھی بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں سے اول "سبق الغایات" ہے۔

۱۔ "سبق الغایات فی نسخ الآیات" یہ قرآن پاک کے آیات و سورتوں کے ربط و نظم پر عربی میں پندرہ صفحات کی کتاب ہے جس کو ۱۳۱۶ھ میں طبعاتی مہینوں میں تصنیف فرمایا، اس میں مولانا نے سورہ فاتحہ سے سورہ الناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیات کے ربط پر کلام فرمایا ہے، اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی "تفسیر کبیر" اور مفتی ابوالسعود بخاری المتوفی ۱۹۵۱ھ کی "ارشاد العقل السلیم الی صریح القرآن الکریم" سے ماخوذ و مستنبط ہے، جس کی تصریح کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے، ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو "قال المسکین" کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ یہ حصہ بھی اچھا

خاصہ ہے اور اخیر کی صورتوں میں زیادہ تراضافات ہی ہیں جن میں مؤلف نے ان صورتوں کے موضوع اور عمود کی تعین فرمائی ہے۔ چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں اس لئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، تاہم ان سے مولانا کے ذوق قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہو سکتا ہے تفسیر البیان میں بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

ذوق ربط آیات

مولانا کے ذوق ربط آیات و سورت کا حال چونکہ عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مواعظ میں سے دو قول نقل کر دیئے جائیں۔ جن سے ان کا ذوق اور ان کے بعض اصول ربط واضح ہو جائیں سبیل النجاح ص ۹ میں فرماتے ہیں:

جواب اس شبہ کا کہ مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع ہیں۔

کیونکہ خدا نے ان ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں



اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے

بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت مصحف اور ہے یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہو گئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہو گئی و علیٰ ہذا تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے۔ اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی۔ تو جبریل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے کہ آیت کو مثلاً سورۃ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورۃ کے ساتھ علیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملا یا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر آپ بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا۔

(سبیل النجاح ص ۹)

پھر اسی کتاب کے ملا میں ارشاد ہے کہ

قرآن کریم کے زیرِ غور و غیر زنجبٹ کلام، میں

قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی مقام میں ایسی رعایت نہیں ہے،
 قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے
 یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو بعض ضابطہ کے پابند ہیں
 ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا۔ اور قانون کے موافق
 رعایا پر احکام لازم کر دے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ دشوار احکام
 کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل یا آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے
 وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا
 چاہتے ہیں اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور
 اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل
 کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر تعجب ضرور ہوتا ہے
 مگر یہ شفقت پر مبنی ہے اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر
 شفقت ہو اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو
 استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ باپ کی نصیحت میں عام
 لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاد تو ضابطہ پری کرتا ہے
 باپ ضابطہ پری نہیں کر سکتا وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے

کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں
 گھر کرے۔ کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے میں کوئی کمی
 نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس طریقہ کو
 وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب
 رعایتوں کا منشاء وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں
 کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت
 بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے
 ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر
 وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک
 بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ
 یہ کیا حرکت ہے۔ لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر
 گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ
 یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر
 مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب
 و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضایہ یہ ہے کہ ایک بات
 کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے
 دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پھر پہلی بات کو پورا کرے۔ یہی راز ہے
 اس کا کہ خدا نے تعالیٰ کا کلام ظاہر میں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے
 اس ظاہر میں بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی

کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا
 کوئی مضمون اس میں نہ آ سکے۔ بلکہ وہ ایک نئے مضمون کو بیان
 فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو
 شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرمادیتے ہیں۔
 اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے
 یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے سورہ
 قیامت میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان
 اس وقت بڑا پریشان ہو گا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا اپنے
 اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے
 کام جتلا دیئے جائیں گے، پھر فرماتے ہیں۔ بل الانسان علی نفسه بصیر
 ولو ألقى معاذیہ (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس
 جتلاتے پر موقوف نہ ہو گا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس کے احوال
 و اعمال سے خوب واقف ہے کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف
 ضروری ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ (باقضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے
 بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے۔ مگر دل میں خود بھی
 جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو
 خوب جانتا ہو گا۔ اس لئے یہ جتلا نا محض قطع جواب اور اتمام حجت
 اور دھمکی کے لئے ہو گا نہ کہ یاد دہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت
 ہی کے متعلق مضمون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لا تحرك

بہ لسانک لتجمل بہ اِنَّ عَلینا جمعه وقرآنہ فاذا قرآنہ فاتج

قرآنہ دشمنان علینا بیانہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے

ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان پر ٹھہرا دینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتہ کی قرأت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ کلام تلحون

العاجلة وقل من وں الاخرة کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں۔ وجوہ یومئذ ناظرۃ الی سبھا ناظرۃ بعض کے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے الخ تو لا تفرح بہ لسانک سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔

”کلامی کہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است“

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ

اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا۔ کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے۔ لیکن جواب ہوا ہو گا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا۔ باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔ اس طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ ہمیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں۔ جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائیگا۔ تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو بھی یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔

۲۔ اشرف البیان لمافی علوم الحدیث والقرآن "مولانا کے چند
مواعظ سے ان کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے
جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں
افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے
اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

۳۔ "دلائل القرآن علی مسائل النعمان" مولانا کو حضرت امام اعظم
کی فقہ سے جو شدید شغف تھا، وہ ظاہر ہے۔ ان کا مدت سے خیال تھا کہ
"احکام القرآن" ابو بکر حصاص رازی، اور تفسیرات احمدیہ "ملاجیوں
کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوق قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق
مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و
اخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پاسکا، آخر میں یہ خدمت اپنے مسترشد
خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی
ہدایت کے مطابق اس کوتاہی فرمائیں، چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں
مصرف ہو گئے۔ ابھی حال میں جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خالق
امدادیہ میں جا کر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے، مولانا روزانہ کی
مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکات ان کو یاد آتے جاتے، بیان فرماتے
اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آ کر قلمبند فرما لیتے یہ تصنیف
اس طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا اور کام ناتمام
رہ گیا۔ امید ہے کہ مفتی صاحب اس کام کو جاری رکھیں گے۔ اور

انشاء اللہ اتمام کو پہنچائیں گے لہ

مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی روایت میں لے سنی ہے جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے، وہ نقل کرتے تھے کہ مجلس میں مولانا آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے اور فقیہانہ وقت نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا لیکن اب تک اس پر اس حیثیت سے نظر نہیں پڑی کتنی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بادل چھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا۔ اسی کے ساتھ وہ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے کہ مولانا سے شکر اپنے مستقر پہ پہنچ کر اس کو بعینہ اسی طرح قلمبند کرتے تھے جس طرح مولانا نے تقریر فرمائی تھی۔

۴۔ تصویر المقطعات لتیسار بعض العبارات "تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو محمل و مغلط بیان ہے، اس رسالہ میں بربان عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے۔ جس سے حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

۵: ۶۔ مولانا کے دوسرے علم القرآن سے متعلق اور ہیں اور ان دونوں کا تعلق سلوک سے ہے ایک کا نام "مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرے کا نام تائید الحقیقہ بالآیات العتیقہ" ہے ان

لہ یہ کام الحمد للہ کہ انجام تو پا گیا ہے گویا اب تک منظر عام پر نہیں آ سکا ہے! (مولف)

دو دنوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر سے ہے۔ جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مؤلف کی تالیف ہے۔ جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۲۷ھ میں تبھا ولپور میں ملا تھا اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔

۴۔ علوم الحدیث

حضرت حکیم الامتؒ کو حدیث میں جو مہارت حاصل تھی اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل و تالیفات کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تلخیصات، ان کے مشکلات کی شرح ان کے دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات و لطائف کا بیان ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو نہانی تقریریں ہیں، بر محل حدیثوں کے حوالے اور اکثر احادیث کے بعینہ الفاظ مع ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالوں کے اس کثرت سے ان میں ہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف پسند کو ان کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ان کی تصانیف کو لیجئے جو کوفقہ و فتویٰ اور احکام و مسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں۔ لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے، ان میں احادیث کے حوالے، دلائل کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید و شہادت کے لئے آئے ہیں، جو مؤلف کے علم و معرفت پر دلیل قاطع ہیں۔

حضرت حکیم الامت کو فن سلوک کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی، اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق تھے، اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب زہد و رقاق کا تذکرہ کیا ہے، تاہم ان کی حیثیت فن کی نہیں۔ قدام میں سے صرف ایک بزرگ امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۸۱۵ھ کا نام ہم کو معلوم ہے، جنہوں نے کتاب "الزهد والرقاق" کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے، مگر یہ سچیدان اس کی زیارت سے محروم رہا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا، مگر قیاس ہے کہ وہ ابن ابی الدنیا کی کتاب کی طرح زہد و رقاق اور مذمت دنیا کے مضامین کی احادیث پر مبنی ہوگی۔

اہل سلوک نے جن روایات احادیث سے کام لیا ہے وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں، اسی لئے علمائے سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا گیا ہے اور اسی بنا پر اہل حدیث و روایت نے یہ برخود غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں اور صدیوں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا، گو بعض محدثین نے ادھر تو جہ فرمائی اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا مثلاً امام ابن ابی حمزہ اندلسی المتوفی ۶۹۹ھ نے صحیح بخاری کی شرح "بہجۃ النفوس" کے نام سے لکھی جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی شرح میں سلوک کے مسائل و نکات کی طرف بھی اشارے

کرتے ہیں۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا اور
 "حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الایقہ" کے نام سے دو کتابیں تالیف
 فرمائیں۔

۱۳۲۷ء میں تالیف پائی ہے اور یہ درحقیقت حضرت
حقیقۃ الطریقۃ کی کتاب التکشف بمہمات التصوف کا آخری
 جزو ہے اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے اس میں تین سو تین احادیث
 سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں، سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا
 گیا ہے اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل
 عادات، رسوم، مسائل، اقوال، توجہات، اصلاح، اور متفرقات کے
 دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ اہل علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

یہ کتاب چار حصوں میں ہے، ان میں ان احادیث
التشرف کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے
 کلام میں آتی ہیں۔ اور یہ دکھایا ہے کہ اصول و فن حدیث کی رو سے یہ حدیث
 کس درجہ کی ہے۔ اور حدیث کی کس کتاب میں ہے اور جو روایات ان میں
 دراصل حدیث نہ تھیں بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے
 اگر وہ اقوال نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ثابت ہیں
 تو ان احادیث و آیات اور ان سے ان اقوال کی صحت کے طریق و استنباط پر
 گفتگو فرمائی ہے۔

حصہ اول تشریف میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج ہے، اس حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام غزالی کی احیاء العلوم ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ ۱۳۴ھ میں لکھا گیا ہے۔

حصہ دوم میں دفتر اول مشنوی مولانا روم اور اس کی شرح کلید مشنوی میں آئی ہوئی احادیث و روایات کی تخریج کی گئی ہے، اسناد احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام بخاری کی المقاصد الحسنیہ سے التقاط کی گئی ہے یہ حصہ ۱۳۴۹ھ میں زیر قلم آیا۔

حصہ سوم و چہارم، ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا بہ ترتیب حروف تہجی مجموعہ ہے۔ ان احادیث کو یکجا کیا گیا ہے۔ جن سے مسائل سلوک مستنبط ہیں اور ان کو بہ ترتیب حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تحقیقات خاصہ کا جا بجا اضافہ اور احادیث کے مطالب کی تشریح و تطبیق اور بعض مشکلات کا حل کیا گیا ہے، حصہ سوم صرف الف کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ۱۳۵۰ھ میں ترتیب پایا ہے، اور حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں اور وہ محرم ۱۳۵۱ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

حضرات اہل حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہیں جامع الآثار اکثر حضرات حنفیہ پر طعن کیا گیا ہے کہ حنفی مسائل کی

تائید میں احادیث بہت کم ہیں اور چونکہ کتب احادیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں، اس لئے ان میں حنفیہ کی مؤید حدیثیں یکجا نہیں ہیں۔ گو امام محمد کی موطا اور آثار اور قاضی ابو یوسف کی کتاب "الآثار" اور مسند ابی حنیفہ مرتبہ خوارزمی اور امام طحاوی کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے، مگر کتب صحاح و مسابند و مصنفات سے جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں جن کمران احادیث و روایات کو یکجا نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائل حنفیہ کی تائید ہوتی تھی۔

یہ ضرورت گو ہمیشہ سے تھی مگر اس زمانہ میں اہل حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ چونکہ اس تحریک کا آغاز پورب و عظیم آباد پٹنہ سے ہوا۔ اس لئے اس ضرورت کا احساس پہلے یہیں کیا گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کے شاگرد رشید مولانا محمد بن علی ظہیر حسن شوقی نیموی عظیم آبادی نے "آثار سنن" کے نام سے کتب حدیث سے النقطہ کر کے اس قسم کی حدیثوں کو شائع کیا، اس کے دوسری حصے شائع ہو سکے، اس کا دوسرا حصہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا، علمائے احناف نے اس کتاب کا بڑی گرجبوشی سے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جو اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس تھے۔ اس کی مدح میں عربی قصیدے لکھے افسوس ہے کہ مولانا نیموی کی وفات سے ان کا یہ کام ناتمام رہا۔

احیاء السنن :- حضرت حکیم الامتؒ نے بھی اس ضرورت کو

کو محسوس فرمایا اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی لیکن افسوس اس کا مسودہ ضائع ہوا۔

کچھ دنوں بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا اور **جامع الآثار** : دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ جامع الآثار کے نام سے مرتب فرمایا۔ لیکن یہ سلسلہ "ابواب الصلوٰۃ" سے آگے نہیں بڑھا، تاہم جتنا مرتب ہو گیا وہ چھپ کر شائع ہو گیا۔

تالیف الآثار : یہ بھی اسی موضوع پر ہے، اور اس کو جامع الآثار کا ضمیمہ بنایا گیا ہے۔

^{۱۳۳۱ھ} میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام **"احیاء السنن" کا احیاء** اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود

اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ اس کے لئے بعض مستند علماء کو رکھ کر کام لیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد احسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا، انہوں نے کام شروع کیا، جو کام وہ کرتے جاتے مولانا کی نگاہ سے گزارتے جاتے تھے۔ اس طور سے کتاب الحج تک کام ہوا۔ اور اس کا نام دوبارہ "احیاء السنن" رکھا گیا۔ تاکہ مرحوم اہماء السنن کی یادگار ہو، اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے

مولانا کی تشفی نہیں ہوئی اور اس پر استاد راک لکھو لے کا خیال ہوا۔ اور آئندہ کام کے لئے مولانا ظفر احمد صاحب تھا نوی کا انتخاب ہوا۔

الاستدراک الحسن

مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر

ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی، وسعت نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو "الاستدراک الحسن" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر "اعلاء السنن" کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا اور اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں مذہب حنفی کی موند حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات، اس کے شروع و حواشی میں یکجا کئے گئے ہیں، امید ہے کہ مولانا ظفر احمد صاحب ابھی اس سلسلہ کو جاری رکھ کر باقی اول کے حق میں صدقہ جاریہ کا باعث بنیں گے۔

جمعہ وعیدین

کے خطبوں

الخطب الماثورۃ من الآثار المشہورۃ

میں اس درجہ تکلف و تصنیع اور مضامین کے ابتذال سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبے نہ ان اور طرز ادا اور مضامین و مطالب کے

لحاظ سے عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر باغیہ اور خطباء کے انہماق قابلیت کا دنکل بن کر رہ گئے ہیں۔ حکیم الامت کی اصلاحی نظر سے محراب و ممبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہیں رہا۔ چنانچہ "المخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ" کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تکلفاتِ بارہ کے گناہوں سے محفوظ رہیں۔

جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ **خطبات الاحکام** تالیف فرمایا جس میں احادیث و آثار و آیات سے ترغیب و ترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے۔

احادیث میں وارد، اوراد واذکار مسنونہ **مناجات مقبول** کے لئے حصن حصین و حزب اعظم ملا علی قاری وغیرہ کتابیں رواج پذیر ہیں۔ مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں، حضرت حکیم الامت نے عام مسلمانوں کے فائدے کے لئے ان سب سے تلخیص کر کے "مناجات مقبول قربات عند اللہ و صلوات الرسول" کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا ہے، جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بحد مقبول ہے۔

علوم الفقہ

حضرت حکیم الامتؒ کو مسائل فقیہہ کی تلاش و تحقیق کا خاص ذوق تھا، اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ و اساتذہ کرام سے ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ ابھی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ان سے فتویٰ نویسی کی خدمت یعنی شروع کر دی تھی اگر حضرت حکیم الامتؒ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۰۱ھ سے بھی کیا جائے تو ۱۳۶۲ھ تک بلابالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے ساٹھ سال اس فن شریف کی خدمت میں بسر کئے اس طویل عرصہ میں ہزاروں مسلوں کے جواب دئے۔ ہزاروں فتوے اور سینکڑوں چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے متعدد ضخیم جلدوں میں امداد الفتویٰ اور تہمتہ امداد الفتویٰ کے نام سے حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ کی فتاوے کے مجموعے جمع کئے گئے ہیں جس کی نظیر ہندوستان میں کم از کم نہیں ملتی۔ و ذالک فضل اللہ یوتیہ من شاء

کے نام سے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس

حوادث الفتاویٰ

زمانے کے نئے مسائل اور نئے مصنوعات سے متعلق ہیں، جن کے جوابات گذشتہ کتب فتویٰ سے بہ آسانی حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

بہشتی زیورہ کی دس جلدیں جو گوعورتوں کی ضروریات کے لئے
ہیں مگر ان میں تمام ابواب فقہیہ کے مسائل مندرج
ہیں جن کے جوابات ہندوستان کے حالات اور ضروریات اور اصطلاحات
کے مطابق صرف انہی کتابوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

ترجیح الراجح یہ وہ مجموعہ ہے جس کی نظیر سلف صالحین میں تو ملے گی
مگر تاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے۔
اس مجموعہ میں حضرت حکیم الامت نے اپنے ان مسائل کو جمع فرما دیا ہے۔
جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا تو
اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ حضرت
کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے، یہی
حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرات تابعین و تبع تابعین اور مجتہدین
عظام کا طریق تھا، جس کو اس زمانہ میں حضرت حکیم الامت نے زندہ
کیا اور اپنے کو بار آخرت سے بچایا۔

فتاویٰ اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ
شائع ہوئے جو مختصر مسائل ہیں

”بہشتی گوہر“ بہشتی زیورہ کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں
خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں، جیسے
جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ۔

ان کے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ ربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ

بنک، سنیما اور فلم اور ریڈیو وغیرہ کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں اور بعض موضوعوں پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے۔

۴۔ علم کلام

علم کلام و عقائد و توحید پر متعدد رسالے قلم بند فرمائے جو شائع و ذائع ہیں، خاص نئے زمانہ کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً "اسلام اور سائنس" کے نام سے "الحصون الحمید" کا مولانا اسحاق صاحب سے ترجمہ کرایا، یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف علامہ حبیری ہیں۔ جنہوں نے سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں اس کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا، اور جو نئے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا، اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسد کا دروازہ نہیں کھولا گیا

"المصالح العقلیہ للأحكام النقلیہ" تین حصوں میں ترتیب پایا ہے۔ جس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم بیان کئے گئے ہیں پہلے حصہ میں نماز و زکوٰۃ، دوسرے میں روزہ، عیدین، صدقہ فطر، قربانی۔ حج، نکاح و طلاق و غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے حصہ میں خرید و فروخت و معاملات۔ حدود و قصاص و فرائض۔ عذاب

اور معاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں

”الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ“ یہ بھی علم کلام ہی کا باب ہے۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدشوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں۔

”اشرف الجواب“ یہ بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے، جو مواعظ و ملفوظات سے جمع کیا گیا ہے جس میں بہت سے نئے اور پرانے شبہات و خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہیں۔

۲۔ علم سلوک و تصوف

علم سلوک و تصوف روح شریعت کا نام ہے جس میں اخلاص دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدما و صوفیاء نے اس پر جو کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً رسالہ قشیر یہ: امام قشیری، قوت القلوب ابو طالب مکی، کتاب للمع، ابو نصر عبداللہ بن علی سراج الطوسی، کتاب الصدق، ابو سعید خراسانی، فتوح الغیب۔ شیخ سہروردی۔ اور غنیۃ الطالبین۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور متاخرین میں تصانیف امام شعرانی، ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے، افسوس ہے کہ مصنوعی اور دوکاندار صوفیہ اور مبتدعہ کی تبلیغ نے اس پر الیسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ کبھی تو بدعات

کا مجموعہ بلکہ بطلان و ضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے پھر ہندوستان میں ہندوؤں کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح کے تمام تر منافی ہیں جیسی کہ وحدت وجود - وحدت شہود و لطائف و دوائے اثر کے مباحث و اعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں، جو یا تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام و خیالات و احوال سے وابستہ ہیں جن کا تعلق لقیات سے ہے۔

اصل شے جو اخلاص فی الدین طلب رضا حصول قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات ہیں اور جن سے مقصود ذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے راستگی ہے، تمام تر متروک ہو گیا تھا، صدیوں کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کی تجدیدی مساعی نے اس فن کو پھر سلف صالحین کے رنگ میں پیش کیا اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے کتاب و سنت کے نور میں اس تاریک زمانہ کے اندر پھر ظاہر کیا، اور زبان و قلم سے ان مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا واللہ الحمد!

اس سلسلہ میں پہلی چیز قصد السبیل ہے جو پچاس ساٹھ صفحات کا مختصر رسالہ ہے، لیکن اس کو ذرہ میں دریا بند ہے۔ فن سلوک کے وہ تمام حقائق و تعلیمات جو سالہا سال سے معلوم ہو سکے اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزل

مقصود کو کم کر دیتے ہیں۔ اس میں لکھ دیتے گئے ہیں۔ اگر کوئی طالب
صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل میں عمر صرف کر دے
تو اس کے لئے انشاء اللہ کافی و کافی ہے۔

جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے
کہ شریعت اور طریقت دو چیزیں ہیں اور اس لئے وہ شریعت سے اس کو
شہرت دی ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے۔
حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے تمام
عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکام الہی کی
باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے۔ دگر ہیج۔ اور یہی
خواص امت کا مذہب ہے۔ اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی
حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے نا آشنا ہے، اس بارگاہ کے
ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے۔

اب توئے نوشتی ہے عین مشرع بر فتوائے شیخ!

اب وہی ہو گا فقیہ شہر جوئے نوشتی ہے

حضرت حکیم الامتؒ نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے

کلام پاک سے مستنبط فرمایا اور اس کے متعلق "مسائل السلاطین من

کلام مدح الملوک" اور "تائید الحقیقۃ بالآیات العنیقہ" نام

دو رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ جن کا ذکر اوپر گزر چکا، پھر ان مسائل سلوک کی تشریح فرمائی جن کا ماخذ احادیث نبوی اور سنت صحیحہ ہے اور یہ "التشفی" اور "حقیقۃ الطریقہ من السنۃ الایقہ" میں مدون ہیں۔

اہل تحقیق کے لئے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب "التکشف بمہمات التصوف" تالیف فرمائی جو پانچ حصوں میں منقسم ہے، یہ حقیقت طریقت، حقوق طریقت، تحقیق کرامت اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل ہے۔

طریق اور سلوک کے اسرار اور رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کے بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رومیؒ کی نے کی جو مثنوی معنوی کے نام سے سرور نواز حقیقت ہے، اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خالق ہی درس میں رہا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے خاص ذوق تھا، اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایمام سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا اور منشی رحمت اللہ مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا حجر العلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت حکیم الامت نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی، سلوک کے مسئلہ طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ کلید مثنوی میں تطبیق فرمائی کہ اب فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کلید کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

دیوان حافظ کی پر جوش و مردانگیں شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط خٹے نوشوں کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا، بدگمانوں کو تو اس شراب معرفت پر شیراز کے باوہ انگور کا شبہ ہوا، اور بے احتیاط خوش گمانوں نے اس سے اباحت کی تعلیم حاصل کی کہ یہ بے فتنہ سجادہ رنگین کن گرت پر مغال گوید

کہ سالک بے خبر نبود و نہ راہ و رسم منزل ہا

حضرت حکیم الامت کی معرفت اس تیز و تند شراب کے منافع واضح سے پوری طرح باخبر تھی، حضرت نے "عرفانِ حافظ" کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی کہ اس پھول سے ہر کانٹا الگ ہو گیا۔

ساتی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کے لئے "تربیتہ سالک

و تخیلہ الہالک" کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا جس میں سالکین کے مشکلات راہ، ذاکرین و شاکرین و شاغلین کے شبہات و خطرات راہ کے لئے ہدایات مندرج ہیں، یہ کہنا بیجا نہیں کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے

متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں، بارہ سو بہتر صفحات میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے۔

ایک دوسرا اہم سلسلہ ملفوظات کا ہے، بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانے سے قائم ہے، یہاں تک کہ چشتیہ حضرات میں حضرات سلطان خواجہ محین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بھی موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اہل شوق اس کام کو پورے استیجاب سے نہ کر سکے، کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلمبند ہو سکے وہ چند سال بلکہ چند ماہ سے زیادہ کے نہیں ہیں۔ اور نہ ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ لکھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظر کہمیا اثر سے گزارا بھی تھا، تاہم چونکہ لکھنے والے خود اہل کمال و اہل احتیاط تھے، اس لئے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لئے بڑی خیر و برکت کی چیزیں ہیں۔

حضرت حکیم الامت کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدون ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر سے گزارا کر چھاپا گیا ہے۔ اور جن میں سے اکثر "حسن العزیز" وغیرہ ناموں سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات میں بزرگوں

قصے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقیہہ کے بیانات، سلوک کے نکات، اکابر کے حالات طالبوں کی ہدایات و تنبیہات، ادب و اخلاق کے نکات۔ اصلاح نفس و تزکیہ کے مجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہل شوق کے دل اور دماغ دونوں اس آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

۸۔ اصلاحیات

حضرت حکیم الامتؒ کے معارف کا یہ آخری باب ہے اور خاصہ اہم باب ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر ان کو بارگاہِ الہی سے عنایت ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، عورتوں سے لے کر مردوں، علماء و فضلاء کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے، اور سب کیلئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یا دگر چھوڑا ہے۔ دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی و غمی کے رسوم اور روزمرہ کی زندگی تک کو وہ محیط ہیں، غرض ایک مسلم جد ہر اپنی زندگی میں رخ کرے، ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے! اس سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم چیز موعظتیں

نہ تو بحمد اللہ زمانہ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بے شمار گزرے ہوں گے مگر شاید وہ عظیمین میں ابن نبیۃؒ اور رائے سلوک میں حضرت شیخ الشیوخ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مواعظ کے سوا کوئی دوسرا مستند اور مفید مجموعہ موجود نہیں۔ لیکن یہ ان بزرگوں کے صرف چند مواعظ پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آخر دور میں امت اسلامیہ کی اصلاح کے لئے بہت بڑا فضل یہ فرمایا کہ حضرت کے مستفیدین کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ حضرت کے مواعظ کو جو شہر شہر ہوئے ہیں عین وعظ کے وقت لفظ لفظ قید تحریر میں لائیں اور حضرت کی نظر سے گزران کران کو دوسرے مسلمانوں کے عام فائدے کی غرض سے شائع کریں، چنانچہ اس اہتمام اور احتیاط کے ساتھ تقریباً چار سو مواعظ جو احکام اسلامی، رد بدعات، نصائح و لہذہ اور مسلمانوں کے مفید تدابیر و تنجید پر مشتمل ہیں اور جن میں حقائق کے ساتھ ساتھ دھچپیوں کی بھی کمی نہیں، مرتب ہوئے ہیں اور اکثر شائع ہوئے اور مسلمانوں نے ان سے فائدے اٹھائے۔

سلسلہ اصلاح و تربیت میں حضرت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عموماً وہ عظیمین صرف عقائد و عبادات پر گفتگو فرماتے ہیں، حضرت ان چیزوں کی اہمیت کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق و معاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصطلاح پر زور دیتے ہیں، بلکہ اپنی تربیت و سلوک کی تعلیم میں بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے تھے حالانکہ عام مشائخ نے اس اہم سبق کو صدیوں سے بھلا دیا تھا۔

مواظظ کے علاوہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ان کی کتاب "حیوۃ المسلمین" ہے جس میں قرآن پاک و احادیث نبویہ ^{صلی اللہ علیہ وسلم} کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ترقی و فلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی ساری تصنیفات میں اس کتاب کی تالیف میں جو محنت اٹھائی ہے وہ کسی میں نہیں پیش آئی اور اسی لئے یہ بھی ارشاد ہے کہ میں اپنی ساری کتابوں میں اس کتاب کو اپنے لئے ذریعہ نجات گمان کرتا ہوں۔

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں اصلاح السرّوم، صفائی معاملات اصلاح امت، اصلاح انقلاب امت وغیرہ میں اور ہر ایک کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو اور ان کے سامنے وہ صراط مستقیم کھل جائے، جو ہدایت کی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔

افسوس کہ اس مضمون کو جس استیعاب اور مہتمام کے ساتھ یہ پیچیدہاں لکھنا چاہتا تھا اپنی علالت و عدم صحت کے سبب اس طرح پورا نہ کر سکتا ہم جو کچھ ہوا وہ اگر مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش ثابت ہو تو بہت ہے۔

طوفانِ اشک لانے سے اے چشمِ فائدہ
دواشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

باب سوم

نقوش عملیه

خانقاہ کی حقیقت و اہمیت

بعض حقیقتیں محض الفاظ کی قدرت کے باعث مانی نہیں جاتیں اور اس کی وجہ محض جدت کا ناز ہے، ورنہ جو نگاہ حقائق تک پہنچ جائے وہ اعتراف پر مجبور ہوگی۔

”خانقاہ“ کے لفظ کے ساتھ عجیبیت و رہبانیت اور خدا جانے کس کس قسم کے غلط تصورات عام طور پر ذہن میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ ”خانقاہ“ ایک ایسے معاملے کا نام ہے جہاں علوم باطنی کی عملی تعلیم و تربیت ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ ایک ایسا ماحول ہے جو غیر اسلامی زہریلے اثرات سے پاک اور روح کے لئے صحت بخش ہوتا ہے۔ اب بتائیے کہ دنیا کا ایسا کون سا تعلیمی نظام ہے جو بلا ترقیبی نظام کے کامیاب ہو سکا ہے اور کوئی تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور کالج ہیں جن کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس اور ہاسٹلوں کا قیام ضروری نہیں ہے؟ اور کس ماہر تعلیم کے نزدیک درس گاہ اور اس کے اقامت خانہ کا ایک ساتھ ایک علیحدہ ماحول میں قیام ضروری و لازمی نہیں ہے؟ مشہور انگریزی ادیب و ماہر تعلیم نیومن (NEWMAN) کے مضامین پڑھ جائیے تو پتہ چلے گا کہ اس نے اس کی اہمیت کو کس زور سے منوایا ہے! اور یہ بات

اس وجہ سے ناگزیر ہے کہ محض کتاب و تقریر سے ذہنیت و عمل کو بدلا نہیں جاسکتا بلکہ اس کے لئے ایک خاص ماحول کا پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اس ماحول کا اثر اتنا گہرا اور قوی ہوتا ہے کہ گو مختلف صلاحیتوں اور استعدادوں کے لوگ یہاں آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق علوم کی تحصیل میں لگے رہتے ہیں لیکن دو چار برس یہاں رہ کر ان کے اندر بطور قدر مشترک، ایک خاص طرز فکر ایک مشترک زاویہ نگاہ اور مشترک طرز زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے آپس میں ہم رنگ اور دوسروں سے ممیز و ممتاز ہو جاتے ہیں۔ یہی منشاء ہے ہاسٹلوں کے قیام کا!۔

آج بڑے بڑے ماہرین نفسیات کو ماحول کے ان قوی اثرات کا اعتراف ہے۔ چنانچہ انہیں میں کے ایک جے، ڈ بلو و اٹسن کا دعویٰ ہے۔

”بارہ صحت مند تو انا بچے میرے حوالہ کرو اور مجھ کو اپنے خاص ماحول میں ان کی تربیت کا موقع دو تو میں ان میں سے بلا تخصیص جس کو جس چیز کا ماہر بنانا چاہوں گا بنا لوں گا۔ ڈاکٹر متفنن آرٹسٹ اور ہاں چاہوں تو بھکاری اور چور بھی۔ خواہ ان کی استعدادیں ان کے رجحانات، ان کی صلاحیتیں اور ان کی نسلی و آبائی پیشے کچھ ہی ہوں۔“

خیر یہ تو انتہا پسندی کی بات ہوئی اور خود دوسرے ماہرین
نفسیات نے بھی اس کو غلو سے تعبیر کیا ہے، مگر ایس، ایس سار جنت کا
یہ بیان تو میزان عدل میں صحیح ہے اور کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ:
”یہ پوچھنا کہ ”ورثہ“ (یعنی موروثی خصوصیات) اصل شے

ہے یا ”ماحول“؟ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی یوں پوچھے
کہ موٹر کار دوڑانے کے لئے کوٹھی چیز اہم ہے موٹر یا بنجن
یا پیروں؟ ظاہر ہے کہ دونوں ہی ضروری ہیں۔ ”ورثہ“
میں تو وہ مواد خام ملتا ہے جس سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے
لیکن جو کچھ بنتا ہے اور جس انداز میں اس کا مواد خام
دھلتا ہے۔ اس کا بڑا انحصار ماحول پر ہے۔ اچھا مواد
اچھے ہاتھوں (یا ماحول) میں پہنچ کر ایک ”اعلیٰ“ صورت اختیار
کرتا ہے اور برا مواد خما کتنی ہی اچھی اس کی پرداخت ہو وہ
کبھی ”درجہ اول“ کا ثابت نہیں ہو سکتا۔“

یعنی کچھ تو ضرور ہی بنتا ہے۔ بقول مجذوب ع

”بیخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!“

انسانی ماحول کا اثر محض ”ذوات انسانی“ تک محدود نہیں

رہتا بلکہ وہ ساری فضا اس گروہ انسانی کے نیک یا

بد اعمال سے ”متاثر“ ہوتی ہے جس میں وہ رہتے بستے

ہیں اور بعد میں خود یہ فضا ایک ”موثر“ بن جاتی ہے!!

اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ جو مدتوں مقتل رہی ہو کسی ایسے شخص کو لے جائیے، جو اس جگہ کی خصوصیت سے بالکل لاعلم ہو، دیکھیے کہ اس کا دل خوا مخواہ دھڑکنے لگے گا۔ پھر اسی شخص کو ایک ایسی فضا میں لے آئیے جہاں بھی اللہ والوں نے پیہم اللہ اللہ اور لا الہ الا للہ کی رٹ لگائی ہو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر وجہ تو نہ بتا سکے گا لیکن اس کو یہاں پہنچ کر سکون میسر آئے گا اور اندر ہی اندر اس کے قلب میں سرور کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔ یہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ فضا خود ایک "موثر" بن گئی ہے!!

غرض انسانی ماحول اور فضا وہ موثرات ہیں جن سے انسانی دل اور دماغ ہر آن متاثر ہوتا رہتا ہے اور ان اثرات کے ماتحت اس کا عمل ایک خاص سانچہ میں ڈھلتا رہتا ہے۔ پس اب جبکہ دنیا کی وسعتیں اکثر و بیشتر غیر اسلامی ماحول سے ٹپی پڑی ہیں تو مسلمانوں کی دینی تربیت کے لئے خاص، تربیت گاہوں کا قیام اور ایک خاص فضا کی فراہمی کس درجہ ضروری اور ناگزیر ہو گئی ہو قیام خالقانہ کا مقصد صرف یہی ہے اور خالقانہ کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں؟

یہ گفتگو تو عقل پرستوں کو مخاطب کر کے کی گئی۔ لیکن آج ایک ایسا گروہ بھی ہے جو خود کو تعلیمات اسلامی کا حامی اور تحریک اسلامی کا علمبردار سمجھتا ہے لیکن اس کی نگاہ چونکہ ان نفسیاتی مسلمات و حقائق تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ "خالق" کے لفظ ہی سے اس پر عجبیت کا فتویٰ

صادر کرتا ہے اور وہ اس کے بغیر دینی اخلاق پیدا کرنے کا مدعی ہے!
 حالانکہ گویا یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کوئی طبیب اپنے نقص علم و فن کی بناء پر
 یہ دعویٰ کرے کہ دق کے مریضوں کے لئے سنٹیوریم قائم کرنا اور
 ان کو وہاں رکھنا سب فضول ہے۔ ان کا علاج تو اسی دق سے
 متاثرہ ماحول میں ہونا چاہیے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد زریں میں بلکہ خلفائے
 راشدین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے دور میں بھی چونکہ مسلمان علم و عمل
 کے فرق سے ناآشنا تھے اور دین کی اصل اور اس کی روح سے پوری
 طرح باخبر تھے اس لئے یہاں کسی الگ دینی تربیت گاہ کا وجود تھا نہ اس کی
 ضرورت! مگر دیکھئے کہ صحابہ اور تابعین کی عظمت و مرتبت
 خود اپنے لقب سے اس بات کا کھلا ثبوت ہی ہے کہ حضور انور
 صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں صحبت "اور ماحول" کو کیا درجہ و مقام
 حاصل ہے، اور اس کا سیرت سازی میں کتنا عظیم الشان حصہ ہے
 اور اس کی وجہ سے ایک مسلمان آنا فانا کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے!!
 ویسے خود عہد نبوی میں اصحابِ صفہ کا وجود اور ان کی تعلیم و تربیت کا
 نظام ایک خانقاہ کا آئیڈیل ہی تو ہے!

جب جامعیت کے یہ دور ختم ہو چکے اور سیاست اور حکومت کی
 نظام ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں آئی جس کی نظر میں دین کا اصل کام
 یعنی تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت، ثانوی حیثیت حاصل کر گیا اور

ملک گیری اور تزک و احتشام ان کی غایت قرار پائے تو بعض نفوسِ سلم
 قدسیہ نے موقع کی نزاکت کو تاڑا، وہ لرز گئے کہ کہیں بعثت نبوی صلی اللہ علیہ
 کا منشائے حقیقی ہی فوت نہ ہو جائے، اسی جذبہ کے ماتحت انہوں نے
 دین کی اصل کو سنبھالنا اپنا فریضہ واحد قرار دیا، سیاست سے کنارہ کش
 ہو کر ایسی دینی تربیت کاہیں قائم کیں جہاں سے دین حنیف کو سمجھنے والے
 اور سنتِ مطہرہ سے عشق و دارِ فکری رکھنے والے پیدا ہونے لگے، یہی تربیت
 گاہیں بعد کو خالقِ کاہیں کہلائیں۔ اور اسی ماحول کے پروردہ "صوفیائے کرام"
 کہلائے۔ ان صوفیائے عالی مقام نے اپنے ان اداروں کے متواتر قیام کے
 ذریعہ تبلیغ و اشاعتِ دین کے وہ کارنامے انجام دیئے جن سے آج تاریخ
 اسلام کی زینیت ہے!

اس سے ہم کو انکار نہیں کہ آج بہت سی "خالقِ ہوں" سنان کی حقیقی
 غرض و غایت مٹ چکی ہے، لیکن کیا اس کی وجہ سے اس ادارہ کی افادیت
 و ضرورت ہی کا انکار لازم آئے گا اور اس کی بچ کنی کی جائے گی؟ یہ تو
 کوئی طریقہ اصلاح نہیں کہ اپنے جن جن اچھے طریقوں اور اصلاح کے
 اصولوں میں جہلا اور نفس پرستوں کے دخل کی وجہ سے خامیاں اور
 خرابیاں آگئی ہوں، سرے سے ان طریقوں اور اصولوں ہی کو ختم کر دیا
 جائے؟ اگر یہی اصولِ اصلاح ٹھہرے کہ جس شے میں خرابی آجائے
 اس شے ہی کو فنا کر دیا جائے، تو پھر ہم کو اپنے مدارس اور مساجد کے
 دروازے بھی بند کر دیئے چاہئیں جن میں بے شمار خرابیاں راہِ پاگئی ہیں!

یہ طریقہ تعمیر کا نہیں تخریب کا ہے ، یہ اصلاح نہیں تباہی ہے !!
 ہر صدی کے سرے پر "مجددین" کے آمد کی نبوی پیش گوئی اس بات
 کی کھلی دلیل ہے کہ اصل سے آمیزش کو دور کرنا اور اصل کو اپنے رنگ
 میں برقرار رکھنا یہی "اصلاح" ہے !!



خانقاہ امدادیہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا، خانقاہوں کا قیام گو اس نام سے نہ ہو مگر ایک تربیتی نظام کی شکل میں ابتدائی عہد ہی میں موجود تھا اور پھر رفتہ رفتہ اکناف عالم میں پھیلا اور آج تک چلا آ رہا ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اکثر خانقاہوں سے ان کے قیام کی اصلی غرض و غایت اٹھتی گئی اور یہ جو گیانہ رسوم و رواج کا آماجگاہ بن گئیں۔ پھر بھی یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں چند خانقاہیں ضرور ایسی رہی ہیں جہاں تربیت اخلاق کا عظیم الشان فرض ہمیشہ انجام پاتا رہا ہے۔ اور یہاں اگر بڑے بڑے اہل علم نے اپنے غرور علمی کو بڑے بڑے امراء نے اپنی نخوت و دولت و جا کو اور کٹر دنیا داروں نے اپنی حب دنیا کو دور کیا ہے، اور اس روح پرور ماحول میں رہ کر صبر و شکر، ایثار و تواضع توکل و قناعت اور اخلاص و ہمت کے اعلیٰ انسانی صفات اپنے اندر پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ کون کہہ سکتا ہے کہ گزشتہ نصف صدی تک گنج مراد آباد میں شاہ فضل الرحمن صاحب کے واسطے سے بھوپال میں شاہ ابو احمد صاحب کے فیض سے اور تھانہ بھون، دیوبند اور سہارنپور میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا خلیل احمد صاحب کے قیام سے اور حیدرآباد

دکن میں شاہ سعد اللہ صاحب مجددی کے وجود سے (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم
 اجمعین) ایہی دینی ماحول پیدا نہ تھا، اور حقیقی خالقِ ہیت موجود نہ تھی؟۔ اس
 سلسلہ کی دورِ حاضر کی آخری کڑی "خانقاہ امدادیہ" تھانہ بھون تھی، جہاں حکیمِ امت
 مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ کے ذریعہ تعلیمِ اخلاق و تزکیہ نفوس کا
 ایک عظیم الشان اور وسیع ترین کام انجام پایا جو موجودہ حالات میں اور
 کہیں انجام نہیں پا رہا تھا۔

تھانہ بھون کی فضا اللہ والوں کے اجتماع اور ان کی پر خلوص طاقتوں
 کے باعث ایسی پر نور اور روح پرور ہو گئی تھی کہ جو بھی چند روز یہاں قیام
 کرتا اس کی کایا پٹ ہو جاتی، کتنے جٹلمین یہاں آکر ایسے ہو گئے کہ مولوی
 بھی ان کے تقویٰ و طہارت سے شرمانے لگے اور کتنے علماء یہاں پہنچکر عقلی
 کاوشوں سے نجات پا گئے اور یقینِ کامل کے سرمایہ سے مالا مال ہو گئے، کتنے
 اخلاق کے کچے، معاملات کے کھوٹے یہاں تربیتِ پاکر معلمِ اخلاق و معاملات
 بن گئے کتنے نا آشنائے حقیقت محض کشف و کرامات اور الوان و لطائف کے
 حصول میں جان کھانے والے آئے اور یہاں آکر ان پر دین کی اصل حقیقت
 کھل گئی اور محض "رضائے الہی" کا حصول ان کا مدعا بن گیا۔

فضا کی سی کیفیت کو اور مقام کی اسی عظمت کو خسرو ثانی خواجہ
 عزیز الحسن مجذوبؒ نے خوب بیان فرمایا ہے اور اپنے چشم دید حقائق کا
 خوب ہی نقشہ کھینچا ہے، خواجہ صاحب شاعر تھے اس لئے اپنے مشاہدات
 اشعار میں بیان کئے ہیں ورنہ یہ کوئی شاعری کی باتیں نہیں ہیں، یہ وہ

حقایق ہیں جو ہر زائر خالقہ کے سامنے کھلے ہوئے ہیں، چند شعر سنئے۔
 عجب فرحت گئے ہیں خالقہ است
 اگر فردوس بروئے زمین است
 عجب نرست گئے ہیں خالقہ است
 یکے ساقی و میخواران ہزارند
 یہ میخانہ بہار است و بہار است
 ہمین است و ہمین است و ہمین است
 خوشا میں بادہ نوشان الہی
 دو چشم مست او مشغول کاراند
 میرا اندازا کران نیم شبہا
 کہ درود و طرب ہرے گسار است
 چہ پرسی لطف و رد صبح گاہی
 زہے رندی زہے شان الہی
 پران ذکر است گوہر تنگ مست
 کہ مشغول اند با لبھا و دہا
 دل میں جسامی کند اللہ اللہ
 چہ صحت بخش است اینجا فضا
 کہ ہر دم لبشتود اللہ اللہ
 تعالی اللہ چہ عالی ہار گاہے
 دل اینجا بے دوا باید شفا
 کس اینجا سیم و زراے ندارد
 کہ اینجا ہر گدائے پادشاہے
 بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
 چہ خود ترک کن کبر و منی را
 کہ کشتے بہ بحر بیکہ ان است
 بیاتادیدہ گردد این شنیدہ
 کہ ہر دم لبشتود اللہ اللہ
 نہ گویم غیر حق کیں امر دین است

کہ مجذوب این ہمہ شنیدہ گوید
 قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید

جی چاہتا ہے کہ خواجہ صاحب کے اشعار کے بعد مرحوم وصل
بلگرامی کے بھی چند شعرا کی نظم "مشاہدات" سے یہاں نقل کئے جائیں جو
انہوں نے اپنی "تالیف" اور "مغان جاوید" میں درج کی ہے:

مشاہدات

اللہ اللہ یہ مقدر
کا شانہ فیض جس کو کہئے
ہر سمت سے انداز ہے ہیں
ہر رنگ نیا نیا سماں ہے
پیالوں میں روح عجز و ایشار
ہر طرف میں بادۂ شریعت
اجھرے ہوئے سادگی کے جوہر
تقوے کی چہل پہل یہاں ہے
شہرت کا یہاں وجود مفقود
دنیا سے جدا یہ سرزمین ہے
کوئی بھی یہاں نہیں مقرب
تدبیر نئی دوائی ہے
تعلیم کا طرز ہی نیا ہے
بعضوں سے تنہا طب و تکلم

حاضر ہوں میں ایسے آستان پر
خنخانہ فیض جس کو کہئے
قسمت سب آزار ہے ہیں
شیشوں میں حیات جاوداں ہے
زہاد سے بڑھ گئے ہیں میخوار
ہر قطرہ میں جلوۂ طریقت
گردش میں وہی قدیم ساعز
مقصود فقط عمل یہاں ہے
ذکر نام و نمود مفقود
کبر و نخوت یہاں نہیں ہے
مصرف ہیں اپنے کام میں سب
اصلاح قلوب ہو رہی ہے
ہر ایک کی تربیت جدا ہے
اس طرح نوازش و ترحم

بعضوں کو یہی امور ممنوع
تا دیب اصول کے مطابق
مجلس کی یہاں کا پوچھنا کیا
الوار کا وہ ہجوم اس میں
ملفوظ کی شان اللہ اللہ
اس حسن مقال کی کسے تاب
چھائی ہوئی چار سو تجلی
اب ہوش کہاں حواس کیسے

ایں مجلس فیض بالیقین است

در بار ولئی حق ہمیں است

وہ بخود در محو و مست ساقی
وہ اشرف اولیائے وراں
وہ زینت مسند شریعت
وہ نائب خاتم النبیین
جام وحدت پلانے والا
وہ حامی دین، امین سنت
وہ کون؟ مجدد زمانہ
اللہ اللہ شان کیا ہے
خاصان خدا خدا نباشند

سرشاری الست ساقی
وہ صدر نشین بزم عرفاں
وہ ہادی منزل طریقت
وہ صاحب عز و جاہ و تمکین
بدعات کا وہ مٹانے والا
وہ غوث زمان حکیم امت
وہ کون؟ محدث یگانہ
جس نے یہ کہا ہے سچ کہا ہے
لیکن ز خدا جدا نباشند

ہاں ایک نظر ادھر بھی ساقی کچھ مہر غلام پر بھی ساقی
منہ مانگی مراد وصل پائے محروم نہ تیرے در سے جائے
یہ طالب عزت غلامی مقبول حسین بلگرامی
در پر تیرے پڑا ہوا ہے تیرا صدقہ وہ مانگتا ہے
یہ دور یہ میسکہ ابد تک
اے تھانہ بھون تجھے مبارک !!



خانقاہ امدادیہ کی کیفیت تو آپ نے محسوس کر لی اور اس کی
رواق کی ایک جھلک بھی نظروں میں پھر گئی۔ اب ایک اور اثر خانقاہ
سے اس کا جغرافیہ بھی معلوم کر لیجئے :

”خانقاہ کی عمارت قصبہ (تھانہ بھون) کی بالکل مغربی سرحد پر
ہے، اس کے بعد اس لین میں کوئی آبادی نہیں، کوئی دو فرلانگ پر ٹاؤن کا
ریلوے اسٹیشن ہے۔ قصبہ کی اکثر پرانی شان دار عمارتوں کی طرح سٹرک
بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنچے کی ہے، عین خانقاہ کے دروازہ تک
آئی ہے، پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے چاروں
طرف پختہ برآمدہ، ٹین کا سا تھانہ اس سلیقہ کے ساتھ کہ آدمی برسات میں
ٹین کے نیچے نیچے پورا چکر لگالے۔ نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض کا زیادہ
حصہ بھا ہوا، ایک لمبا حصہ کھلا ہوا، پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو
دونوں طرف غسل خانے ملیں گے، چھوٹے لیکن ضرورت کے لئے کافی

جاڑوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں سائبان طے کر کے آپ اندرون دروازہ میں داخل ہوئے، جوتے اتارے کہ صحن مسجد شروع ہو گیا، جوتا رکھنے کے لئے ایک چپڑ کا بڑا ملبس کھلا ہوا دکھائی دیا۔ اب آپ مشرق سے اپنے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب مڑے، یہیں کنواں اس کے آگے بیت الخلاء جانے کا راستہ۔ اس کے بعد مہمان خانہ کا زمینہ، مہمانوں کے لئے کمرہ کوٹھہر پر سادہ مگر ہوادار گنجائش آتی کہ چار مہمان ایک وقت میں آسانی سے ٹھہر سکیں۔ زمینہ سے چند ہی قدم اور آگے چلے کہ رخ شمال میں چلتے چلتے اپنے واسطے ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب کرناٹھرا اور ایک لمبا برآمدہ ملا، اس برآمدہ میں دوسرے دریل ہیں پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانہ کا کمرہ، دوسری سہ دری خاص حضرت کی نشست گاہ ایک حجرہ اس کے عقب میں، دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونہ پر، یہی حجرہ حضرت حاجی صاحب کا تھا اور ایک کوٹھری اس کے جواب میں برآمدہ کے مشرقی کونہ پر، اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آگئے۔ مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں لیکن بڑی پر رونق اور پراخوار اور ساتھ ہی گنجائشی اور آرام دہ، ختم مسجد کے بعد سالکین کے لئے حجرہ۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لئے لڑکوں کا مدرسہ قرآنی، خاتمہ پر زمینہ اور کچھ اور حجرے، اوپر اور نیچے کے یہ سب حجرے طالبوں کے لئے ہیں۔ اب پھر آپ اپنی داہنی طرف یعنی مشرق کی جانب مڑے اور جنوبی برآمدہ میں آگئے۔ اس کا نصف حصہ مدرسہ اور مہمان کے لئے ہے اندرونی درجہ میں متعدد مہمانوں کی

گنجائش، ہرآمدہ کے دوسرے حصہ میں مدرسہ کی اونچی جماعتیں یعنی
ہدایہ خواں طلبہ کی درس گاہ۔ اس کے عقب میں رسالۃ النور کا دفتر
حضرت کے بھتیجے اور خانقاہ کے مہتمم و نگراں مولوی شبیر علی صاحب کا
کتب خانہ تجارتی، اس کے بعد آپ شمال کی جانب ایک بار پھر مرٹے
اور مشرق میں کنارہ پر چلتے چلتے چند قدم کے بعد دروازہ پر واپس پہنچ گئے
حجروں کی قطار ادھر بھی موجود اور وضو کے لئے باقاعدہ نالیاں اس
مستطیل کے مشرقی ضلع میں شمال سے جنوب تک برابر بنی ہوئی۔

(حکیم الامت ص ۱۹۱ تا ۱۹۲ از مولانا دریا بادی مدظلہ)

آہ کہ اب یہ مکان، وہ مکان نہ رہا کیونکہ مکین کو نظر میں نہ جاتی ہیں مگر پانی نہیں

عمر آن قدح بشکست و آن ساقی نماند

اس خانقاہ پر انوار الہی کی جو بارش ہوتی تھی اس کو لوگوں نے
انوار محسوس ہی نہیں کیا بلکہ بعضوں نے کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ
بھی کیا، حضرت حافظ جلیل احمد صاحب علی گڑھی (جو حضرت تھانوی کے خلیفہ
تھے) ایک مرتبہ رات کی ٹرین سے تھانہ بھون آئے، جب ٹرین خانقاہ
کے محاذ سے گزر رہی تھی تو انہوں نے صاف دیکھا کہ خانقاہ کی مسجد کے
گنبد سے آسمان تک انوار کا تار بندھا ہوا ہے،



ضبط اوقات و تنظیم کار

دینداری اور لا ابالی " آجکل مترادف الفاظ سمجھے جا رہے ہیں، عقل و فراست سلیقہ و تمیز کا داخلہ گو یا دین کی حکمرانی میں ممنوع ہے، اچھے اچھے پڑھے لکھے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دیندار کے پاس نہ کسی ضابطہ کی حاجت ہے، نہ قواعد کی ضرورت، اس کے ہاں نہ وقت کی کوئی قدر ہونی چاہیے نہ کام کی کوئی تنظیم، حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے پیروے زیادہ اور کس کی سیرت ہے جو بیک وقت بے تکلفی و سادگی اور نظم و ضبط کا جامع نمونہ ہو سکتی ہے؟

حیرت ہے کہ جس ذات والا صفات نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ "بعثت لمتمم مکرم الاخلاق" میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں، اس کے پیرو آج رہن سہن میں، بول چال میں، لین دین میں اور زندگی کے تمام طور و طریق میں کسی بھی نظم و ضبط کے پابند نہ سمجھے جائیں؟ حکیم الامت کی (مجددانہ) شان کا یہ وصف بہت ممتاز ہے کہ آپ نے اپنی خارجی و داخلی زندگی کا ایسا اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا جان گئی کہ اہل حق ایسے بھی ہوتے ہیں، اور صاحب دانش مان گئے کہ دین کے مصلح ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے ناواقفوں نے اعتراض کیا کہ یہ اصول پسند

تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر گفتگو کے طور پر لقی متعین، یہ بھی کوئی درویشی ہے؟

ع۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیلہ کہئے

خالقہ امداد یہ میں وہ سارے اصول برتے جاتے تھے اور ان پر سختی سے عمل کر دیا جاتا تھا، جن پر ایک استاد و شاگرد اور پیر و مرید کے زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ کا مدار ہے۔ یہ اسی اصول پسندی کا اعجاز تھا کہ تنہا حضرت تھانویؒ نے علمی و عملی وہ وہ نقوش چھوڑے اور اس کثرت سے چھوڑے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔! اور یہ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ سب اصول معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ماخوذ و مستنبط تھے۔

خارجی زندگی دوسروں کی سہولت اور اپنی راحت کے لئے حکیم الامت نے خالقہ میں اپنے نظام الاوقات کا اعلان ذیل آویزاں کر رکھا تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اعلان انضباط اوقات احقر!

تاکہ نہ اہل حاجت کا حرج یا تکلیف ہو نہ احقر کا

ع۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں اس وقت کسی سے ملنے میں یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے اور حرج بھی ہے۔

۲۱ البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہے اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں جہالت نہیں ہو سکتی مثلاً دروازہ وغیرہ کا تعویذ لینا ہو یا فوری ضرورت کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو جس میں تاخیر نہ ہو سکے مگر ان تین شخصوں کو چاہئے کہ آتے ہی کہیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۲۲ پھر بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ و نماز کا وقت ہے اس میں ملاقات سے اور نیز سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

۲۳ پھر جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے آنے کی بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی تعویذ وغیرہ مانگنے کی، البتہ جمعہ کا دن تعویذ سے مستثنیٰ ہے! ۲۴ پھر اذان عصر سے نماز سے فارغ ہونے تک کے لئے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ کے وقت کا ہے جو نمبر ۳ میں مذکور ہے۔

۲۵ پھر عصر سے فارغ ہونے کے بعد سے عشاء سے فارغ ہونے تک کے لئے وہ قاعدہ ہے جو صبح سے ۱۲ بجے تک کے وقت کا ہے جو نمبر (۱) میں مذکور ہے اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہیں۔

مکے عشاق کے بعد تو علی الاطلاق معذوری ظاہر ہے، باستثنای اضطراب

شدید۔

۸۔ یہ قواعد ان صاحبوں کے لئے ہیں جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہو۔ اس کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں تو میری مجلس سے ملحق رہہ درمی کی دیوار میں ایک مکس لگا ہے اس میں لکھ کر ڈالیں اور جس موقع پر جواب چاہتے ہوں اس کا پورا پتہ لکھ دیں مثلاً فلاں نمبر کے حجرہ میں یا مسجد کے ممبر پر ہمیشہ بعد نماز فجر ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے تحریری جواب مل جائے گا اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں تو ایسے ہی پرچہ کے ذریعہ سے تنہائی کا وقت پوچھ لیں۔ میں جو وقت بتلاؤں اس وقت بات کر لیں اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

۹۔ بعض ہمالوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلاتا ہوں، دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں اور اسی طرح ایک کو کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جب تک خاص اجازت حاصل نہ کریں، اسی طرح دوسری خدمت بھی بلا صریح اجازت نہ کریں جیسے جوٹا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ۔

۱۰۔ راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں نہ گھر جا کر بیٹھیں۔

نوٹ: یہ سب قواعد ان صاحبوں کے لئے ہیں جو عقیدت مندی

کے ماتحت ہو کر آتے ہیں اور جن کو کوئی دوسرا تعلق بھی ہو ان کیلئے

یہ ضوابط نہیں۔ البتہ اگر کسی کو کسی خاص قاعدہ کا پابند کر دوں تو اس کو اس کی پابندی لازم ہے۔

نوٹ: کسی وقت ضرورت سے کچھ ترمیم کر دوں تو ترمیم ہی پر عمل ہوگا۔ اسی طرح ذاتی ملازموں کے لئے دوسرے ضوابط ہیں جو ان کو زبانی بتلا دیئے گئے ہیں۔

کتبہ اشرف علی عفی عنہ

اسی طرح نوواردین خانقاہ سے تعارف حاصل کرنے کے لئے آپ نے ایک فارم بنارکھا تھا۔ جس کی خانہ پر ہی کر کے ضروری تعارف بہ سہولت حاصل ہو سکتا تھا۔ چونکہ آپ مسند ارشاد پر فائز تھے اور ہر ٹپے لکھے اور ہر عامی کے لئے آپ کی تربیت گاہ کھلی ہوئی تھی اور عوام و خواص کا رجوع سینکڑوں کی نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھا اس لئے آپ نے ایسے انوکھے اصول استعمال کئے اور ان کو سکھایا جن کی وجہ سے زندگی کا سلیقہ و حسن اور اس کی راحت و آسائش ہر ایک کو میسر آ گئی۔

خود حکیم الامت رحمہ کی زبانی اس حکمت کو سنئے :

”بعض حضرات احقر کے پاس خاص مقصد کے لئے تشریف لاتے ہیں جن کی بجائے ان کے مفصل حالات ضروریہ کے مطلع ہونے پر موقوف ہوتی ہے، مگر اکثر کامیرے سوال کرنے پر بھی جواب نہیں ملتا یا بہت ہی ناتمام ملتا ہے یا کئی کئی بار کے پوچھنے پر ملتا ہے جس سے طبعاً اذیت ہوتی ہے۔ اور اذیت سے تنگی و کدورت ہو

ان کے مقاصد میں محفل ہوتی ہے چونکہ اس کی وجہ پوچھنے پر اکثر نے
تصریحاً یہ وجہ بیان کی کہ زبانی سوال سے انتشار ہو جاتا ہے
اس لئے سہولت کے لئے ذیل کا نقشہ تجویز کرتا ہوں کہ یہ نقشہ
پیش کر دیا کروں اور وہ اس کی خانہ پری خود یا کسی سے کروا کر
مجھ کو عنایت فرما دیا کریں۔ جانبین کو اس میں راحت ہوگی۔

نشان شمار	سوال	جواب
۱	نام	
۲	وطن اصلی	
۳	اس وقت کس مقام سے آنا ہوا اور اس مقام میں کتنا قیام رہا	
۴	شغل و وجہ معاش	
۵	موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں	
۶	علمی استعداد اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے۔	
۷	اصلی مقصد آنے سے کیا ہے	
۸	محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی، اور مجمع میں یا تنہائی میں کسی سے بیعت ہیں یا نہیں اور	

نشان شمار	سوال	جواب
۱۰	کس سے اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا اور تعلیم کس سے متعلق ہے۔ میرے مواعظ اور سائل کیا کیا دیکھے ہیں۔	
۱۱	اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دکھلائی جائے۔	
۱۲	کتنا قیام ہوگا	
۱۳	کہاں قیام ہوگا۔	
۱۴	خانقاہ میں اول بار آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوا تھا۔	
۱۵	یہاں کے انتظام طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں۔	
۱۶	باہر والا پٹرا اعلان قلمی دیکھ لیا یا	

لے یہ وہی اعلان ہے جو اوپر درج ہو چکا۔

اس کے سوا ہر طبقہ کے افراد کے لئے الگ الگ اصول و ضوابط متعین

تھے اور سب میں یہی روح کار فرما تھی کہ پیرو مرید، آنے والے اور ملنے والے دونوں کو راحت ملے۔ وقت ضائع نہ ہو اور خواہ مخواہ کی ملاقاتیں ختم ہو جائیں

اب کوئی انصاف سے بتائے کہ کیا یہی نظم و ضبط ”انگریزیت“ ہے؟ اور کیا اس انضباط کو بخیل و جیسوں، تصانیف، سینکڑوں مواعظ ہزاروں ملفوظات اور روزانہ پچیس پچیس تیس تیس خطوط کے حکیمانہ جوابات دے سکتے تھے؟

خانقاہ کی ڈاک حکیم الامت کے ہاں ڈاک اس کثرت سے آتی اور روز کے روز اس کا جواب جاتا کہ یہ خود

ایک کرامت تھی، اس کی کچھ تفصیل سنئے تاکہ ہماری بات کا یقین آئے:

”ڈاک لانے والی اصل گاڑی سہارنپور کی طرف سے دوپہر

یا ذرا قبل تھا نہ بھون ٹاؤن کے اسٹیشن پہنچتی اور کچھ دیر بعد ڈاک کی بھیلی اسٹیشن سے ڈاک خانہ پہنچ جاتی، کچھ منٹ چھانٹنے میں لگتے اور اس کے بعد مولانا کی ڈاک ٹین کے چنگے میں بحفاظت روانہ ہو جاتی، ڈاک کا

اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخوا دار ملازمین دیہ تعداد میں عموماً دو

رہا کرتے، میں سے ایک صاحب ضرور وقت مقرر پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے اور ڈاک کیہ کے ذریعہ سے تقسیم کا انتظار کئے بغیر اسے لے کر چلتی و

مستعدی کے ساتھ حاضر خدمت ہو جاتے۔ حضرت کبھی تو اس وقت تک

سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جا چکے

ہوتے، ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے، خصوصاً

پرسٹ کارڈ، ان کو اسی وقت پڑھ دلتے اور ڈاک کا جواب اسی کے دو گھنٹہ کے بعد ظہر کی مجلس کے لئے اٹھ دیتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ تیس پتیس سے کیا کم ہوتی، بعض دن اور زائد، پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں بڑے لمبے چوڑے، ورفقہ، سلوک، کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق، اب حضرت ہیں اور خطوط کا پشتارہ، اگر دگر و حاضرین نرم حلز کئے ہوئے، خواص بھی عوام بھی، مسکے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے بڑے، حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں، حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی خط کا جواب اسی کے حاشیہ پر یا بین السطور تحریر کرتے جاتے ہیں جواب کی جامعیت سبحان اللہ، اللہ اللہ و ماشا کتنا حاضر پایا تھا، عموماً یہ سارے جوابات اسی طرح قلم برداشتہ لکھ دئے جاتے اور اتنے جامع اور محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پورے غور و فکر کے بعد بھی نہ بن پڑنے خال خال خط ایسے بھی ہوتے جن کو جواب کے لئے مولانا دوسروں کے حوالے کر دیتے، یہ وہی خط ہوتے جن میں کتابوں کے حوالہ کی ضرورت ہوتی۔ بار بار ایسا بھی ہوتا کہ یہ انبار بھی مٹنے نہ پایا تھا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی آجاتی اور دو چار خط اس میں بھی ہوتے۔ جواب کے لئے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب دوسرے ہی دن نکل جائیں۔ اگر دن ختم ہو گیا اور ڈاک ختم نہ ہو پائی تو اب مولانا اس سن و سال میں بعد نماز مغرب و اوراد مغرب، لائین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے بیٹھ گئے ہیں اور اتنے سکے تک کام کر کے، ڈاک کو اپنے ہاتھ سے ختم ہی

کر کے اٹھتے ہیں۔“ (نقوش و تاثرات ص ۱۹۵ تا ۱۹۷)

یہ تھا حکیم الامت کا کمال کہ تھوڑے سے وقت میں بے شمار فادہ،
تحریراً بھی تقریراً بھی اور توجہات باطنی کے ساتھ بھی !!

اصول سفر یہ تو دورانِ قیام کے چند اصول تھے، اب سفر میں
دیکھئے، سفر ہو یا حضر آپ نے نہ کبھی فرمائشی و عظمیٰ

نہ وعظ گوئی کا کوئی معاوضہ قبول کیا بلکہ احتیاط تو اس درجہ تھی کہ جہاں
جاتے عام دعوتوں سے گریز فرماتے کہ یہ بھی معاوضہ ہی کی ایک صورت ہے
اور اپنے ساتھیوں کا ہا کسی پر نہ ڈالتے ہمراہیوں کو اس کی تاکید تھی کہ جب تک میرا
ان سے بطور خاص درخواست نہ کرے اور وہ حکیم الامت سے اس بارے میں
اجازت حاصل نہ کریں، کوئی دعوت قبول نہ کریں، کبھی ایسے مقام پر قیام نہ فرماتے
جہاں عام مسلمانوں کو آنے اور ملنے میں دشواری ہو، ایسا بھی ہوا کہ کبھی کسی خوش
عقیدہ امیر کے ہاں قیام کا موقع آیا لیکن اس کی ضرورت بھی یہ رہی کہ اہل خانہ
کے لئے تو وقت متعین و مقرر رہا اور باقی بیشتر وقت عوام کے لئے خالی
رکھا گیا و الیٰان ریاست کی ملاقات سے عموماً گریز فرماتے کیونکہ اس میں
نفع کی کوئی امید نہ پاتے تھے۔

حکیم الامت جب سفر کا قصد فرماتے تو پہلے اس کی مقدار و غرض
متعین ہوتی۔ پھر اس کے مطابق سامان اور دوسری سہولتیں مہیا کی
جاتیں اور اتنے دنوں کے لئے ڈاک کا انتظام پہلے ہی سے فرمایا جاتا۔
دورانِ سفر ہر جگہ سے گھر کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ تاکہ اہل خانہ اور

اور اہل خانقاہ مطمئن و بے فکر رہیں۔ سفر میں درجہ سوکیم کو ترجیح دیتے تھے۔ ویسے جب سہولت ہوتی تو درجہ دوم و اول میں بھی سفر کرتے تھے۔ دوران سفر خطوط کے جوابات اور تصنیف کا کام برابر جاری رہتا تھا۔

سفر کرتے ہوئے حبیب غیر مسلموں سے گفتگو کی نوبت آتی تو ایسی جامع اور دل نشیں گفتگو فرماتے کہ اہل باطل پر اسلام کی حقانیت کا سکھ بیٹھ جاتا تھا۔ البتہ دوران سفر کسی کو بیعت نہ کرتے تھے بلکہ اس سے خواہش کرتے تھے کہ تھانہ بھون آکر کچھ عرصہ دیکھ لے، صرف باتوں میں نہ آجائے کیونکہ باتیں بنانا تو بہت آسان ہے اصل شے عمل و اخلاص ہے جس کے بغیر مقصد بیعت حاصل ہونا محال ہے۔ اس اصول میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ لوگ بیعت کو محض رسم اور سستا سودا نہ سمجھ لیں بلکہ اس کی حقیقت و وقعت بھی ان کے ذہن نشین ہو جائے۔ البتہ خواتین اس سے مستثنیٰ تھیں!

یہ حق تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ سفر میں آپ کو کبھی علالت کی نوبت نہ آتی اور تبلیغ و اشاعت دین میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ داخلی زندگی خارجی پہلو دیکھ چکے اب مولانا تھا نوی کی داخلی زندگی کو بھی دیکھئے تاکہ یہ بات کھل جائے کہ وعظ و پند اصول و ضوابط صرف اغیار کے لئے ہی نہ تھے بلکہ گھر کی بنی زندگی میں بھی ان پر پوری پوری نگاہ رکھی جاتی تھی اور اپنے عمل سے ان کی افادیت منوائی جاتی تھی، البتہ ہر موقع و مقام کے لحاظ سے اصول بھی جدا تھے، جیسا کہ ہونا چاہیئے!

حکیم الامتؒ کی دوازدواج تھیں، اس لئے جو بھی نقد یا جنس کی شکل میں آتا مساوی مساوی کر کے اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے۔ غیرت کا یہ عالم تھا کہ دونوں کے مہر ادا کر دیئے تھے اور باوجود فریق ثانی کی طرف سے معافی و اصرار کے واپس لینا کبھی گوارا نہ فرمایا۔ — ڈاکٹر عبدالحی صاحب۔ مدظلہ، (خلیفہ حضرت حکیم الامتؒ جن کو حضرت کی خانگی زندگی سے بہت زیادہ واقفیت ہے، احقر نے سنا کہ حکیم الامتؒ کے دو مکان تھے اور دونوں کو اپنی دونوں ازواج کی ملکیت میں دے چکے تھے۔ ان مکانوں کو پہہ کرنے کے بعد حضرت کو اس سے بھی حجاب آتا تھا کہ بغیر کسی کرایہ کے ان مکانوں میں رہ کر اپنی بیویوں کا منت پذیر ہوں، چنانچہ ایک مرتبہ خوش اسلوبی سے آپ نے یہ بات دونوں کے سامنے رکھ دی کہ ماہانہ کچھ کرایہ لے لیا کریں، اس پر دونوں بگڑیں کہ یہ کیا غیرت کی بات ہے! حکیم الامتؒ نے ہر چند سمجھایا کہ یہ غیرت کی نہیں بلکہ اپنی غیرت کی بات ہے مگر دونوں نے بھی نہ مانا، آپ خاموش ہو گئے مگر پھر رہتے دم تک یہ طریقہ رکھا کہ بلا اظہار خاص کر یہ کی نیت سے کچھ روپیہ دونوں کو دے دیا کرتے تھے۔ تاکہ ان کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں اور اپنی خود داری کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ — ع۔ اقبال کرم جی گزدار باب ہم ملا

آپ سخت گیر نہ تھے، کبھی گھر والوں سے تکلف و تحکم کا برتاؤ نہ کیا بلکہ ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتے تھے اور گھر میں بہت ہشاش بشاش رہتے، گویا اس ارشاد نبویؐ کی تفسیر بن جاتے کہ تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔ اپنی ازواج کے مہانوں کی پوری

فاطر و مدارات کرتے اور ان کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے کیونکہ
اپنے سردار و مطاع حضور الفوری صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز ہی تھا۔

اصول برتنے والوں میں ایسے بہت سے دیکھے ہوں گے جو دوسروں پر
تو قواعد کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں لیکن خود ہر قید و بند سے آزاد
رہتے ہیں۔ حکیم الامت ایسے نہ تھے، پہلے خود پابند ہوتے تھے اور پھر
تلفیقین فرماتے تھے، مولوی شبیر علی صاحب کو آپ کے بھتیجے اور ابتدائی
سے ہر معنی میں آپ کے زیر تربیت تھے اور ان پر حضرت کو ہر طرح کا حق
حاصل تھا، لیکن آپ نے ان کے معاملہ میں کبھی کبھی بے اصولی نہ برتی،
جب وہ خود آپ کی خدمت میں کسی غرض سے آتے تو کبھی اپنا کوئی کام
ان کے سپرد نہ فرماتے، مصلحت یہ تھی کہ آئندہ ان کو آنے میں تکلف نہ ہو
اور اس تصور سے کنارہ کشی نہ کر لیں کہ صاحب وہاں جائیں تو کوئی نہ کوئی کام
لگا دیا جاتا ہے جب کوئی کام لینا ہوتا تو حضرت خود ان کے پاس جاتے
اور فارغ پاتے تو کہہ دیتے ورنہ لوٹ آتے تھے۔ اور یہ تو پھر بھی
بھتیجے تھے، اپنی ازواج سے کبھی کھانا کھا کے یہ نہ فرمایا کہ "برتن اٹھاؤ"
بلکہ یہ فرماتے تھے "برتن اٹھاؤ" تاکہ ان کا وقار متاثر نہ ہو اور جذبات
کسی درجہ میں کبھی مجروح نہ ہونے پائیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ
نوکر اگر دیر سے اٹھتا تو خود اپنے آپ کو عموماً کسی کام میں مشغول
فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے حوالے سے اطمینان کے ساتھ فارغ ہو سکے
اور یہ خیال اس کو دامنگیر نہ ہو کہ آپ اس کے منتظر ہیں، اسی طرح

اپنے نوکروں کو تاکید تھی کہ خواجواہ کھڑے نہ ہوں، سلام کر کے بیٹھ جائیں اور اپنا مدعا ظاہر کر دیں۔ آپ اپنے ملازموں کو پیسے کبھی پھینک کر نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے سامنے رکھ کر ان سے فرماتے کہ یہ اٹھا لو تاکہ ایک طرف ان کی تحقیر نہ ہو اور دوسری طرف مال و زر جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اس کی قدر ملحوظ رہے۔

اہل خانہ پر حتی الامکان بوجہ نہ ڈالتے تھے۔ حتی کہ کبھی کسی خاص پکوان کی فرمائش بھی نہ کرتے تھے۔ البتہ جب خود ادھر سے فرمائش کرنے کا تقاضہ ہوتا تو اس میں بھی ایسا اسلوب اختیار فرماتے کہ ان کی دل شکنی ہو اور نہ ان پر بار پڑے۔ فرماتے تم ہی چند کھانوں کے نام لو جو یہ آسانی پک سکیں۔ ان میں جو مجھے مرغوب ہوگا بتلا دوں گا۔

باوجود کثرت مشاغل کے روزانہ گھریا بندی سے تشریف لے جاتے تاکہ ان کی خبر گیری و دلداری رہے ان کی بیماریوں پر پوری فراخ دلی سے روپیہ صرف فرماتے اور ضرورت ہوتی تو دور دراز مقامات پر خود لیجا کر علاج کرواتے، اس طرح ”تعلق مع اللہ“ کے بہانے ”حقوق العباد“ کو کبھی پاٹمال ہونے نہ دیتے تھے، یہ تو ان راہبوں یا جوگیوں اور دوکاندا

کا شعار ہے جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نا آشنا ہیں، جن کے نزدیک عبادت اور تعلق مع اللہ کا رشتہ اتنا نازک اور کوتاہ ہے کہ مسجد و خانقاہ کے باہر قدم رکھتے ہی تار تار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ سنت کے اتباع میں جو فعل خواہ مسجد و خانقاہ میں ہو، خواہ گھر اور بانساریں

عین عبادت اور ترقی قرب کا موجب ہے اور یہی صفت ”بے ہمہ و باہمہ“
کمال انسانیت کی دلیل ہے۔“ ورنہ رہبانیت و جوگیت کو لانا مشکل کام ہے

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر

کز دیو و دژ ملولم و انعام آذر و ست

حکیم الامت نے دو عقد کر کے عدل و انصاف کی وہ نظیر قائم کی
کہ اب لوگوں کے لئے عقد ثانی کی جرأت مشکل ہو گئی، خود فرماتے تھے۔

”میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل
سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جس کی باری ہے
اور یہ اس کی حق تلفی ہے۔ اب میں اپنے کپڑے خالقِ ہدی میں رکھتا ہوں
کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہوتی
کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔“

یہ ہے عدل اور خدا ترسی، اور یہ ہے نفس کشی اور بندوں کے
حقوق کی پاسداری!!

مجدد ملت کے اس شعار کو غور سے دیکھئے اور جان لیجئے کہ دنیوی
میں معاشرت و معاملات و اخلاق اتنے ہی مہتمم بالشان ہیں جتنے عقائد
اور عبادات تکمیل دین کے لئے ان پانچوں پہاڑوں پر یکساں نظر ضروری
آپ کو سخت رنج ہوتا جب شوہروں کے ظلم و ستم کی روایتیں آپ
یکسختی سے، آپ ہر ایک کو اپنی بیوی پر مہر و کرم، عفو و درگزر اور پاس و پست
کی تلقین فرماتے تھے!

توازن طبع

در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

حق تعالیٰ کی محبت کو جان و دل میں بسا کر کھیر بھی اپنے جذبات کو عقل کے تابع اور عقل کو شریعت کے تابع رکھنا کوئی مذاق نہیں یہ صرف کاملین کا حصہ ہے۔ ابتدائی اوراق میں گزر چکا کہ حکیم الامت نسباً فاروقی تھے، آپ کے اندر محبت و غیرت دین اور حسن انتظام و سیاست کی وہی آن موجود تھی جو اسوۂ فاروقی کا طغرائے امتیاز ہے لیکن بعض نادانوں نے آپ کے مزاج کی اسی "حدت" کو "شدت" و بد خوئی سمجھا اور تنقیدیں بھی کیں۔ حالانکہ یہ ان کی نادانی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عرفانی تو یہ ہے:

آسمان میں دو فرشتے ہیں ان میں سے ایک سختی کی فرمائش کرتا ہے دوسرا نرمی

کا اور دونوں صواب پر ہیں۔ ان میں ایک جبریل (علیہ السلام) ہیں اور دوسرا

سہ مولانا مکتا لوفیؒ کی سختی کو بہت زیادہ اچھا لے اور مولانا کو سخت گیر

مشہور کرنے میں کچھ حصہ خود مولانا کے اکثر معتقدین کا بھی ہے جنہوں نے ان کی

سیرت کے پر شفقت پہلو کو یکسر نظر انداز کر کے صرف دار و گیر ہی کے پہلو کو موضوع تذکرہ

بنالیا یا خود محتسبانہ روش اختیار کر کے اس کو اتباع شیخ سے تعبیر کرنے لگے!

عمر نہ ہر کہ سر تیرا شد قلندر ی و اند

میکائیل (علیہ السلام) میں اور دونوں میں ایک نرمی کا امر فرماتے ہیں دوسرے
شدت کا اور دونوں صواب پر ہیں اور وہ ابراہیم (علیہ السلام) اور نوح
(علیہ السلام) اور میرے دو صحابی ہیں ایک نرمی کا امر کرتے ہیں اور دوسرے
شدت کا وہ ابو بکرؓ و عمرؓ ہیں۔ نیز ارشاد ہے۔

”تیزی میری امت کے لوگوں کو پیش آتی ہے اور تیزی کا سختی بوجہ عزت
قرآن کے قرآن والے سے زیادہ کوئی نہیں“ دیکھنے والوں نے دیکھا اور
صبح سے شام اور شام سے صبح تک، مہینوں نہیں برسوں تک دیکھا کہ
اگر خلافت دین امور پر آپ برہم ہو جاتے تھے تو دوسری طرف قلبی شفقت
کا یہ اثر تھا کہ عام مسلمان پر وہ اپنے آپ کے اطراف گھماتے تھے اور جو
بظاہر زبان سے جھڑکے جاتے تھے وہ بھی دراصل دل سے کھینچے ہی جاتے
تھے بقول مجذوبؒ

زبان سے وہ کچھ ہی کہے جاتیں مجھ کو

نگہ دے رہی ہے پیام محبت

پس تربیت کے لئے اصول صحیحہ کی پابندی میں کسی قدر سختی کا اظہار
اصلاح و درستگی کی خاطر تھا نہ کہ دل کی قسادت کی وجہ سے، دل کی قسادت
کی دلیل تو قرآن پاک نے صاف بتا دی ہے کہ ”اے رسول صلی اللہ علیہ
وسلم، آپ ”غلینظ القلب“ ہوتے تو لوگ آپ کے اطراف نہ گھماتے“ یعنی
لوگوں کا سمٹ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کا قلب مبارک شفقت و رافت کے جذبات عالیہ سے معمور ہے

تانا سوز و شمع کئے پروانہ شیدائی شود؟

اصل یہ ہے کہ شفقت کے مفہوم اور مقام "ارشاد" و "تبلیغ" کی ذمہ داریوں کو لوگوں نے سمجھا نہیں ہے، حضرت شیخ اکبر رحمی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں۔

”شفقت و رحمت کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں کہ تم اپنے بھائی کو عذاب و دوزخ سے نکال کر جنت کی طرف لے جاؤ اور جہل سے علم کی طرف اور مذمت سے حمد کی طرف اور نقصان سے کمال کی طرف منتقل کر دو شیخ کے لئے یہ شرط ہے کہ مرید کی ہر لغزش پر جو اس سے صادر ہو تنبیہ دے کر کرے اور اس میں عفو و درگزر کو راہ نہ دے۔ اگر عفو سے کام لیا تو اس مقام کا حق ادا نہ کیا جس مقام پر وہ قائم ہے بلکہ وہ ایک بادشاہ ہے جو اپنی رعیت سے خیانت کرتا، اور اپنے رب کی حرمت و عظمت پر قائم نہیں اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے سامنے اپنا چہرہ ظاہر کرے گا (یعنی جس کا جرم ظاہر ہوگا) اس پر حد قائم کریں گے۔“

اپنے مقام و منصب کی یہی ذمہ داری تھی جو حکیم الامت کو سختی پر مجبور کرتی تھی ورنہ بارہا آپ نے فرمایا کہ ”یہ طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے، اور مجھے

بعد کو بڑی کلفت و ندامت بھی ہوتی ہے اور وہ کہہ کر سوچا
 کرتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا،
 بچے یوں سمجھنا نے کے یوں بھی سمجھا سکتا تھا، بچے اس تجویز کے
 یہ تجویز بھی کر سکتا تھا، لیکن عین وقت پر مصلحت اصلاح کا ایسا
 غلبہ ہوتا ہے کہ اور کوئی مصلحت پیش نظر رہتی ہی نہیں۔ اور یہ
 جیسا تک ہے جب تک میں نے اپنے ذمہ اصلاح کی خدمت سمجھ
 رکھی ہے اور اگر بھی اس سے قطع نظر کر لی تو پھر میں انشاء اللہ
 تعالیٰ خوش اخلاق بھی بن کر دکھلا دوں گا۔ میرا اصلی مذاق تو
 یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض ہی نہ کروں اور اپنے آپ کو سب
 یکسور رکھوں بقول احمد جامؒ

احمد تو عاشقی بہ شیخت ترا چہ کار

دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

حکیم الامت کی شفقت کا تو یہ حال تھا کہ مدتوں بہائم تک کے لئے
 آپ نے دعا فرمائی ہے تو پھر انسانوں کا اور خصوصاً مسلمانوں کا کس درجہ
 خیال نہ رہتا ہرگز کون کی شکست پر اپنے درد دل کا یوں اظہار فرمایا تھا:
 اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ہمیشہ راحت ہی راحت میں رکھا ہے اس لئے
 میں نے کبھی یہ نہ جانا کہ غم کیلئے لیکن اب معلوم ہوا کہ غم
 اس کو کہتے ہیں کیونکہ ترکوں کی شکست اور مسلمانوں کی ذلت
 خواری کا قلب پر اتنا شدید صدمہ ہے کہ کھانا پینا بھی تلخ ہے۔

حدود و شریعت کے تحفظ کا یہ حال تھا کہ پورے دو سال کی تحقیق و
تفتیش سے اپنے والد ماجد کے ذمہ جوہران کی چار بیویوں کا رہ گیا تھا ان کے
ورثہ کا پتہ چلا چلا کر والد مرحوم کے ترکہ سے ادا کیا، اور جب تک ایک
پائی ادا نہ ہوئی، چین نہ لیا! — یہ ہے عملی وعظ! اگر سب واعظ ایسے واعظ
بن جائیں تو آج ملت کے دن نہ پھر آئیں!!

حکیم الامت کی نہ عادت تھی نہ آپ کو پسند تھا کہ مخالفین کے اعتراضات
کے جواب دیے جائیں، حق بات کا اظہار کر کے خاموش ہو رہتے تھے، فرمایا کرتے کہ:
”جب میں سنتا ہوں کہ کسی مناظرہ میں اہل بدعت کے مقابلہ
میں اپنی جماعت غالب آگئی تب بھی صدمہ ہوتا کہ عوام کیا
کہتے ہوں گے کہ مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں، ایسے مناظروں
سے عوام کو بہت ضرر پہنچتا ہے اور باطل کو فروغ ہوتا ہے،
اگر ان پر التفات ہی نہ کیا جاتا تو ان کی یہ ہمت نہ بڑھتی“

اس سے بھی بڑھ کر حکمت آموزا و رشفقت آمیز ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ
سے آپ خود تو مخالفوں کا کیا جواب دیتے، کوئی مخلص اگر آپ کی طرف سے جواب دیتا
تو اس کو بھی پسند نہ فرماتے تھے، ایک مرتبہ مخالفین نے حضرت پر بے سرو پا اتہامات
لگائے تاکہ آپ کو حکومتِ برطانیہ کا حامی ثابت کیا جائے، محترم مدیر ”سچ“ نے
ان کی تردید کی اور سچی بات ظاہر فرمادی ساتھ ہی حضرت کو اس سے مطلع کیا،
جو جواب عنایت ہوا اس کو پڑھئے اور سرد صغئے:

”یہ آپ کی محبت ہے، مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا

اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ
ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر
مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے، تو ایک مسلمان کو
عاصی بنانا کیا فائدہ؟ (حکیم الامت نقوش و تاثرات ص ۲۳)

یہ ہے کمال انسانیت! پھر یہ بھی کمال توازن ہی کا نتیجہ تھا کہ مخالف سے اختلاف
خواہ کتنا ہی شدید ہو مگر اس کی خوبیوں پر برابر نظر رہتی تھی، اور جس طرح اختلاف کا
انہما رے با کا نہ ہوتا تھا، اسی طرح خوبی کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی سے ہو جاتا تھا،
مولانا محمد علی مرحوم سے حضرت کا سیاسی اختلاف عالم آشکار تھا، لیکن دیکھئے کہ ان کے
”جوہر“ پر بھی کیسی نظر تھی اور اس کا کس بے نفسی سے اعتراف فرمایا ہے۔

”محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا،
خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجھ کو مرحوم
کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، ضرر
ایک صفت، مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے، باقی دوسری
صفات دیکھنے والے جانتے ہیں، میں نے کبھی دیکھا نہیں، اسلئے
ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات
سمجھتا ہوں“ (حکیم الامت نقوش و تاثرات ص ۱۷)

”اعِدُّوْا هُوَ اَقْرَبُ لِتَقْوٰی“ کا کیا عملی درس ہے!

حکیم الامت کے متوازن مزاج اور عاشقِ سنت ہونے کی یہ بھی دلیل ہے
کہ ہر امر میں جہاں تک گنجائش ہوتی سہولت ہی پسند فرماتے تھے کیونکہ حدیث

شریف میں صاف موجود ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے ہمیشہ اسی چیز کو اختیار فرمایا جو ان دونوں میں آسان تھی۔“ راز یہ ہے کہ اس میں اپنی کم طاقتی کا اعتراف ہے اور اپنی در ماندگی کا اظہار اور یہی عاجزی و تواضع ”عبدیت“ کا خاصہ ہے !!۔ پھر یہ بھی مجرب صادق صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فرمان ہے کہ ”من شاق شاق اللہ علیہ“ جس کی ترجمانی لسان الغیب نے یوں کی ہے۔

گفت آساں گیر بر خود کار ہا کز دوسے طبع
سخت می گیر و جہاں بر مردمان سخت کوشش
پھر کیوں نہ سہولت کو محبوب رکھا جائے !

عام حدود اخلاق کے تحفظ کا یہ حال تھا کہ جب کسی نے ”نجدی مسلک“ اور نجدیوں کے خلاف سخت سست الفاظ میں رد لکھا اور یہ تحریر آپ کی خدمت میں آئی تو صاف صاف لکھ دیا :

”ان رسالوں کے نفع سے غالباً میں محروم رہوں گا جو اہل نجد کے متعلق ہیں کیونکہ بوجہ فقدان ذرائع ”مخالفت و موافقت“ میرا مسلک ان کے طرز عمل کے باب میں سکوت ہے اور ذرائع مندرجہ سالیں کی بھی مجھ کو شرعی تحقیق نہیں، ان کے باب میں سکوت ہی ہے، البتہ ان کے مسائل مجھ کو معلوم ہیں ان میں سے بعض میں ان کے ساتھ مجھ کو سخت اختلاف ہے جیسے ”مفہوم شرک میں غلو“، اور ”جیسے توہم میں یا شدہ حال میں تشدد“ مگر

ان کے رد کے وقت بھی میں سخت الفاظ استعمال نہیں کرتا۔

مزاج کی ان کی ساری باریکیوں اور اصول پسندیوں کے باوجود، اور ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں مریدوں اور جاں نثاروں سے ہمدردی و شفقت کا تعلق ہوتے ہوئے بھی، یہ حکیم الامت کا کمال تھا کہ قلب کسی بات میں اٹکا نہ رہتا تھا۔ اور اللہ کی مخلوق سے پوری شفقت و محبت کے تعلق اور ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کی پاسداری کے باوجود آپ کا دل ہمیشہ خالق کی یاد سے معمور رہتا تھا۔ ہر بات میں اسی کے مشاہدہ سے مسرور رہتا تھا، خود فرماتے تھے :

”ان مجذوب صاحب کی توجہ کا جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں، یہ اثر ہے کہ کسی میں دل اٹکا ہوا نہیں، یوں اپنے متعلقین و احباب سے بے حد محبت ہے لیکن یہ نہیں کہ کسی کی مفارقت سے پریشانی ہو۔ اور دھیان لگا رہے بس تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے۔ الحمد للہ میرے قلب میں ”حرارت“ ہے ”قساوت“

نہیں اور مزاج میں ”حدت“ ہے ”شدت“ نہیں !
صاحب جلال اور صاحب جمال بزرگ تو پھر بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن صاحب توازن و اعتدال ”صدیوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں !

تبلیغ و اشاعت دین

مجددین کا ظہور خیر القرون کے بعد سے یہ تو ہوتا ہی آیا ہے کہ شریعت اسلامی کے صاف و بے داغ چہرہ پر جہلا اور دنیا داروں نے خاک ڈالتے کی کوشش کی ہے، اور اپنے اپنے وقت پر ہر جگہ مجددین نے اس گرد و غبار کو صاف کر کے شریعت کے حقیقی حسن و جمال کو دکھایا ہے۔ پہلی صدی میں عمر ابن العزیز حسن بصری یا امام باقر وغیرہ۔ دوسری صدی میں امام شافعی یا یحییٰ بن محبین امام الجرج و التعذیل تیسری میں حافظ ابن شریک، امام ابوالحسن اشعری یا نسائی صاحب سنن نسائی۔ چوتھی میں امام باقلانی، امام سہیل بن بابوہا مدیا حاکم صاحب مستدرک پانچویں میں امام اعزالی چھٹی میں امام رازی و رافعی۔ ساتویں میں ابن وقیف العبد و ابن تمیمیہ۔ آٹھویں میں امام بلقینی یا حافظ زین الدین عراقی۔ نویں میں سیوطی۔ یا امام سخاوی، دسویں صدی میں شمس الدین بن شہاب الدین۔ گیارہویں میں شیخ احمد سرہندی۔ ابراہیم بن حسن کروی نزلی مدینہ۔ بارہویں میں شاہ ولی اللہ دہلوی شیخ صالح محمد بن نوح نزلی مدینہ۔ تیرہویں میں مولانا سید احمد بریلوی۔ و مولانا اسماعیل شہید۔ رحمہم اللہ علیہم معین

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھو، مقدمہ جامع المنجد دین

یہ سب حضرات اسی مقام اعلیٰ پر فائز رہے۔ اور اپنے اپنے دور میں ان بزرگوں نے عجمیت، بدعات اور رسوم و اویام کی بیخ کنی کر کے سنت مطہرہ کو زندہ کیا، ان کے کاموں ہی سے اہل تقویٰ و فراست نے ان کے مجدد ہونے کا گمان غالب کیا ہے۔ ورنہ کسی مجدد کا مجدد ہونا کوئی از عانی اور لغتینی مسئلہ نہیں اور نہ کسی مجدد نے اپنی شخصیت کی کبھی دعوت دی ہے اور جس کسی نے ایسا کیا ہے وہ باطل ہے کیونکہ مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جزو بھی نہیں ہے۔ ہندو کہ راہِ خود گم نہ کئی! پھر یہ کہ ہر صدی میں اس مسئلہ کے تحین میں نیک نیتی سے دو شخصوں کی رائیں حسب عقیدت و محبت مختلف رہی ہیں اور رہ سکتی ہیں، ان میں سے کسی ایک پر ایمان و اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پھر سوال ہوتا ہے کہ اس ظنی و قیاسی مسئلہ پر کسی درجہ میں بھی زور دینے کی وجہ آخر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجدد وقت کو نہ پہچانتے اور اس کو اپنا رہبر نہ بنانے کی وجہ سے کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی اور پوری پوری پیروی سے اکثر محروم رہتی ہے اور بدعات و فسادات کے دلدل سے نکلنا دشوار ہوتا ہے اور مسلمان ٹھیک ٹھیک صراطِ مستقیم پر رہ نہیں سکتا جو نہایت ضروری چیز ہے اور جس پر ثمرات دینی کا مدار ہے، اگر اس مسئلہ کو اتنی اہمیت بھی نہ ہوگی تو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ بشارات نہ دے جلتے کہ تلبیہ اللہ تعالیٰ میری امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے کو پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا کر دے گا۔

چودھویں صدی میں مجدد تیرھویں صدی میں مولانا اسماعیل شہیدؒ

ان کے پر حضرت سید احمد بریلویؒ کے مساعی کے بعد ہندوستان میں پھر
 علی العموم بدعات و رسوم کو فروغ ہو چلا تھا۔ طریقت و حقیقت کے نام
 سے زندگی بھیل رہا تھا۔ دھرم و کاندھار و صوفیہ کے ڈھونگ سے تو تعلیم یافتہ
 طبقہ میں دین سے تنفر پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے میں رحمت باری کو پھر جوش ہو
 اور اس نے تھانہ بھون کی خاک سے سلسلہ میں ایک ہستی پیدا فرمائی۔

جس نے سلسلہ میں مسند ارشاد پر آکر سلسلہ تک اپنی زبان و قلم اور
 علم و عمل کے ذریعہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش کو پھر سے
 اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی۔

آپ کی ہمہ گیر اصلاحات سے آپ کی حیات ہی میں لوگوں کو آپ کے
 مجدد و وقت ہونے کا گمان ہو چلا تھا، ایک مولوی صاحب نے ایک مرتبہ حرات
 کر کے خود حکیم الامت سے یہ بات پوچھی، جواب ملا:

”چونکہ نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس کا احتمال

مجھ کو بھی ہے، مگر اس سے زیادہ جزم نہ کرنا چاہئے۔ محض ظن

ہے اور یقینی تعین تو کسی مجدد کا نہیں“

مسئلہ تجدید کی نوعیت و نزاکت کو سمجھنے اور اس حکیمانہ ملفوظ کو

سننے کے بعد اب تو شبہ نہ رہا ہو گا کہ ”مجددیت“ کو منوانے کی کوشش کرنا طرح

نامناسب اور فیوض و تعلیمات اشرفیہ کی اشاعت کو محدود و محصور کرنے

کے مترادف ہے۔ تعلیمات اشرفیہ جوں کی توں پیش کر دیجئے دنیا خود اس کی شہادت

و عظمت کی قائل ہو جائے گی۔ عطر آہست کہ خود ہوید نہ کہ عطار بگوید

وعظ کے ذریعہ تبلیغ حکیم الامت کے قلمی و علمی کارناموں کا ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا۔ یہاں صرف لسانی و عملی حصہ کا ذکر مقصود ہے۔ آپ کا پہلا وعظ خود آپ کے والد ماجد کی فرمائش پر شاید اٹھارہ برس کی عمر میں جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا جس کی تفصیل خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نہ بانی یہ ہے۔ "سب سے پہلا وعظ میں نے جہاں تک مجھ کو یاد ہے والد صاحب کے حکم سے کہا تھا۔ جبکہ میری شادی ہوئی تھی والد صاحب تو تقسیم طعام کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے انہوں نے تو حوض والی مسجد میں جمعہ پڑھا میں اور ماموں و اجداد علی صاحب جامع مسجد میں جمعہ کے لئے گئے والد صاحب نے ماموں صاحب سے فرما دیا تھا کہ نماز کے بعد وعظ کا اعلان کر دیں چنانچہ انہوں نے اعلان فرما دیا۔ میں بڑا گھبرا یا کہ وعظ کیونکر کہوں گا۔ میں نے ماموں صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اعلان کیا ہے تو آپ ہی وعظ فرمائیں۔ فرمایا تم کو کہنا ہوگا۔ بالآخر میں مجبور ہوا ممبر کے اوپر تو نہیں بیٹھا بلکہ نیچے کے حصہ پر بیٹھ گیا۔ اور سر جھکا کر اَللّٰہُ اَکْبَرُ کا کتاب لاسیب فیہ " چند آیتیں پڑھ کر ان کا ترجمہ کیا اور تھوڑی دیر مطلب بیان کر کے ختم کر دیا، اس کے بعد جو مسجد سے باہر نکلا تو مجھے ماموں صاحب نے آگے چلنے کو فرمایا میں نے عذر کیا آپ سے آگے کیوں کہ چل سکتا ہوں، فرمایا اب تم مقتدا ہو گئے اور مقتدا احترام کا ضروری ہے، اگر تم گھر کے آدمی ہی احترام نہ کریں گے، تو دوسرے کیوں کر احترام کریں گے اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ تم آگے چلو حکم سے مجبور ہو کر مجھے آگے چلنا پڑا وہ میرے پیچھے چلے اللہ اللہ، پہلے بزرگوں کو مصالح پر کیسی نظر تھی پھر رات کو مولانا

شیخ محمد صاحب تھا لڑی کو خواب میں دیکھا مولانا بڑے خوش تقریر تھے
 مجھے مولانا سے بہت محبت تھی اور مولانا بھی مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے۔
 مجھے مولانا کے انتقال کا بہت رنج تھا، میں نے خواب میں بھی یہی عرض کیا کہ
 مجھے آپ کے انتقال سے بہت رنج ہے، فرمایا میں تو اب بھی تمہاری طرف سے متوجہ
 ہوں جیسا کہ زندگی میں تھا۔ اس کے بعد میرے کسی وعظ میں رکاوٹ نہیں
 ہوئی، اور پھر تو ہم "سراج الوداعین" ہو گئے: (دیکھو بزم جمشید)

پھر تو شہر بہ شہر اور قریہ قریہ میں وعظ ہوتے رہے اور یہ حالت یہی کہ

رشتہ در گمردنم افکنده دوست

می بردہر جا کہ خاطر خواہ دوست

ہندوستان کے اکثر چھوٹے بڑے شہروں اور ریاستوں کے
 والہ الخلافوں میں آپ کے وعظ ہوئے اور ہر جگہ ان کی برکت سے دکاندار
 مشائخوں کے بازار سرد ہو گئے، ان کے گاہک کم ہو گئے، تو تعلیم یافتہ لوگوں کی
 آنکھیں کھلیں، انہیں دین کی صحیح تصویر نظر آئی، ان کے شکوک و شبہات رفع
 ہو گئے اور دین کے حقیقی جلوہ نے ان کے دلوں کو موہ لیا نتیجہ یہ کہ سیکڑوں
 جنٹلمین عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو گئے۔ مواعظ کی پرتا شری کا
 ثبوت اس سے زیادہ کیا چاہیے کہ جس شہر میں چند وعظ ہوئے مسجدیں آباد
 ہو گئیں۔ قلوب ذوق اتباع سنت سے معمور ہو گئے۔

سو سو کو مست کرتے ہیں اک اک نگاہ میں

جس بزم میں گئے اسے میچا نہ کر دیا

آج بھی جو کوئی کم از کم خالی الذہن ہو کر ہی ان مواظظ کا مطالعہ
 کرے تو دل میں دین کی عظمت و محبت پیدا ہو جاتی ہے، صراطِ مستقیم پر چلنے
 کی ہمت آ جاتی ہے اور دنیا کے دوا سے گھٹن آنے لگتی ہے!! نظر مخلوق سے
 ہٹ کر خالق پر جم جاتی ہے اور مقصود زندگی صرف اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے!!
 انگلستان میں بالواسطہ تبلیغ آپ کی تبلیغ گوہندوستان کی حد تک
 خاص کئی لیکن اس کے بالواسطہ اثرات افغانستان و ایران بلکہ انگلستان
 تک پہنچ گئے تھے، چنانچہ آپ ہی کے ایک ہم وطن معتقد، مرحوم حبیب احمد
 تھانوی یورپ گئے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی اسلام کی خوبیاں سن سن کر
 کچھ انگریز عیسائی مسلمان ہو گئے۔ ان میں بعض اعلیٰ خاندان و طبقہ کے لوگ
 بھی تھے۔ چونکہ حبیب احمد صاحب حکیم الامت سے خط و کتابت رکھتے تھے
 اس لئے بعض انگریزوں نے حضرت سے اپنے نام غیبی تجویز کرائے حکیم الامت
 کی ہر ادا حکمت آمیز و حکمت آموز تھی، ایک لیڈی پروفیسر جس کا نام "براڈے"
 تھا حبیب وہ مسلمان ہو گئی تو آپ نے ان کا اسلامی نام "بریدہ" دکھ کر
 آئی ہوئی۔ مراد کفر سے اسلام کی طرف، رکھا جس سے وہ بڑی خوش ہوئی کہ
 تلفظ کی دقت بھی باقی نہیں رہی اور نام اسلامی ہو گیا، اسی طرح ایک اور
 انگریز خاندان مسلمان ہوا اس کو حکیم الامت سے اس درجہ محبت ہوئی کہ
 ہندوستان آکر نیاز حاصل کئے بغیر چین نہیں آیا۔ صدر خاندان کا نام
 شیخ فاروق احمد تھا، یہ تعلیمات اسلامی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی
 وضع قطع اور پوشاک تک بالکل بدل ڈالی!!

حبیب احمد صاحب کے ذریعہ آپ کا فیض انگلستان میں اسی طرح پہنچتا رہا، جب کچھ امیدیں زیادہ بندھیں تو مرحوم نے حضرت کو انگلستان آنے کی دعوت دی تاکہ تبلیغی کام پوری قوت سے ہو سکے، آپ نے عزم فرما لیا اور اپنے ساتھ ایک انگریزی داں رفیق کو بھی منتخب فرما لیا اور احتیاطاً داعی کو لکھ بھیجا کہ :

”اگر میرے طرز تبلیغ اور جوابات سے وہاں کے لوگوں کو تشفی ہوتی ہو اور نفع کا قوی امکان ہو تو یہ سفر اختیار کروں، ورنہ مناسب نہیں۔“

لیکن حق تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ انگلستان کی تاریکی دور ہو، آپ کے اس خط کا جواب آنے نہ پایا، اور حبیب احمد صاحب تھا قوی راہی ملک بقا ہو گئے اور حضرت نے ہمیشہ کے لئے ارادہ ترک فرما دیا۔

تبلیغ کی تاکید اور مجلس ”دعوة الحق“ آپ کی تمنا تھی کہ تبلیغ کا اہتمام بھی تعلیم کی طرح لازمی کر دیا جائے چنانچہ مدارس دینیہ کو ہمیشہ اس طرف متوجہ فرماتے رہے اور

اپنے مدرسہ میں خود بھی اس پر عامل رہے، فرماتے تھے :

نصوص کثیرہ صلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی تاکید بھی

وارد ہے اور سورۃ والعصر تو بلا شرکت خاص اس موضوع

کے لئے نازل ہوئی ہے اس میں جہاں تصحیح عقائد و اصلاح اعمال

کو نجات کی شرط فرمایا ہے جو حاصل ہے خسران سے بچنے کا،

دہیں تو اسوۃ بالحق و تو اسوۃ بالصبر میں دوسروں کی تعلیم عقائد و اعمال کو بھی شرط جات میں داخل فرمایا ہے اس کے علاوہ قرآن و حدیث میں ہی مضمون کے اور بے شمار نصوص امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور وعظ و تذکیر کے عنوان سے نہایت تاکید اور اہتمام کے ساتھ مذکور ہیں اور اس میں سستی و ترک پر شدید وعیدیں بھی وارد ہیں۔ نیز انبیاء علیہم السلام کا خاص فریضہ یہ رہا ہے باقی دین کے جتنے شعبے ہیں مثلاً افتاء درس و تصنیف وغیرہ سب اسی کے آلات و مقدمات ہیں، خود تنظیم (یا حکومت) جس کی ضرورت سب کو تسلیم ہے۔ اسلام میں وہ بھی اسی کے تابع اور اسی کا مقدمہ ہے۔ چنانچہ اس آیت الذین امكناهم فی الارض الخ میں جہاں تمکین کے مقاصد ذکر فرمائے ہیں ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بھی جزو مقصود فرمایا گیا ہے۔

غرض اسی اہمیت کے پیش نظر رسالہ ”حیوۃ المسلمین“ برٹمی تحقیق و تدقیق سے تصنیف فرمایا اور اس کی اشاعت کے بعد لوگوں میں تبلیغ و اشاعت دین کی ایک خاص صورت بھی تجویز فرمائی اور ”مجلس دعوت الحق“ کے نام سے اس کا ایک تنظیمی خاکہ مرتب فرمایا۔

اس مجلس دعوت الحق کا مقصد تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین کی

۱۰ سالہ یہ دور سالے ہیں جن میں وعظ اور واعظ کے دستور العمل مرتب کئے گئے ہیں۔

عملی ترویج کے ذریعہ مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنا اور کامیابی
کا راستہ بتانا ہے۔ جو مسلمانوں کے لئے تعلق مع اللہ میں منحصر ہے
اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی پوری پابندی کی جائے۔
تناہ امکان کوئی بات خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ یہی عبدیت
کی روح اور مسلم کی زندگی کا اصل اصول ہے۔“

اس مقصد کے لئے متدرجہ ذیل نظام العمل مرتب فرمایا:

- (۱) تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین کی تمام دفعات کی نہایت
خلوص و استقلال کے ساتھ ہمیشہ پابندی کرتے رہیں اور
ہر امر میں اعلیٰ سطح نظر رضائے حق ہو اور اس استقلال
ہمت کے ساتھ ہی دعا و انتہال کو اصل و طیفہ و تدبیر سمجھیں۔“
- (۲) جہاں تک ہو سکے قرآن شریف کا ترجمہ سننے کا بھی اہتمام
کریں۔

(۳) مسلمان کا فرض ہے کہ ہر موقع پر جذبات کو شریعت
کے تابع رکھے۔

(۴) اخلاق اسلامی کو اپنا شعار بنائے، وضع و معاشرت کو
بالکل شریعت مقدسہ کے موافق رکھے نہ انگریزوں کی
تقلید کرے نہ ہندوؤں کی نہ کسی اور کی۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کا مسنون طریقہ تھا کہ ہاتھ میں لاٹھی

رکھتے تھے اس واسطے سب مسلمانوں کو اس سنت پر کار بند
رہنا چاہیے۔

(۶) خدمتِ خلوت کا خیال رکھیں، محنت و جفاکشی کی عادت کیلئے
ورزش بھی کیا کریں، نیز لکڑی وغیرہ چلانا بھی سیکھیں اور سادہ
وسپاہیانہ زندگی بسر کریں۔ یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ کسی سے
لڑیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آرام طلبی میں نہ پڑیں۔ مخدوم بنیں
خادم بننے کی کوشش کریں۔ اگر کسی انسان بالخصوص مسلمان کی
مدد کرنے کی ضرورت ہو تو مظلوم کی امداد کو لازم جانیں۔
(۷) ہر مسلمان روزمرہ نماز عشاء کے بعد سونے سے پیشتر
اپنے گناہوں کو سوچ کر یاد کرے اور پھر ان نعمتوں کو یاد
کرے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر ہیں اور ان دونوں
کو یاد کر کے اپنے کو ملامت کرے کہ جس مالک کی اس قدر
نعمتیں ہیں اس کی ایک دن میں تجھ سے کس قدر نافرمانیاں
ہوئیں۔ اس کے بعد دل سے ان سب گناہوں سے توبہ
و استغفار کر کے سوئے روزانہ بلا ناغہ یہ عمل کرے۔

اس کے بعد بعض خاص دعائیں درج کر کے ہر نماز کے بعد ان کو
پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

خود آپ نے اپنی حیات میں انہیں اصول کے ماتحت مبلغین
مقرر فرمائے تھے جن کی وجہ سے سہارا بنو اور اسکے اطراف میں خصوصاً

اور کل ملک میں عموماً بڑا فائدہ پہنچا، آریوں کی ریشہ دوانیاں ختم ہوئیں۔
اور اتداد کا سیلاب ختم ہو گیا مولوی عبد المجید صاحب۔ بکیر الہی خاص
طور پر اس میدان کے شہسوار اور غازی رہے !

دعوت الحق کے نظام العمل اور اس کے طریق کار کے سلسلہ میں یہاں اس
امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ پوری اسکیم ایک مجبورانہ ماحول میں بنائی گئی
تھی اور خود مولانا تھانویؒ کے کھتیجے مولانا شبیر علی صاحب سے، جن کے ہاتھوں
تعلیم المسلمین اور تفہیم المسلمین کے دفعات لکھوائے گئے، راقم نے سنا ہے کہ
حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کئی مرتبہ کی کانٹ چھانٹ کے بعد اس وقت کے حالات
کے پیش نظر جہاں تک ممکن العمل نظام بن سکتا تھا پیش فرمایا ورنہ مقصود
تنظیم تو اس سے بھی زیادہ عظیم تر تھا، اور وہ ہر مسلمان کو صبح و سجدہ کے
ساتھ ساتھ شمشیر و سناں سے مسلح دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اب پاکستان
کی ایک گونہ آزاد فضا میں ضروری نہیں کہ تعلیم المسلمین وغیرہ کے دفعات
کو لفظاً لفظاً ضروری و اہم سمجھا جائے بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ مجلس دعوة الحق
کی روح کو قائم رکھتے ہوئے اس کے طریق کار میں ضروریات وقت کے
مطابق ترمیم کی جائے اور یہ کام حضرت مولانا تھانویؒ کے مذاق آشنا
اہل رائے حضرات کا ہے !

تبلیغی جماعت سے قلبی تعلق اور بشارت
حکیم الامت کو
مولانا محمد الیاس

صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تبلیغی جماعت سے دلی لگاؤ تھا اور اس سے

بڑی امید رکھتے تھے۔ اسی لئے باوجود اس جماعت کے طریق عمل سے
قد رے اختلاف ہونے کے اپنے بعض خدام کو اس میں شریک ہو کر
کام کرنے کی تاکید فرمائی تھی، اپنے ایک فرستادہ کے ایک عریضہ کے
جواب میں تحریر فرماتے ہیں :

حالات سے بہت کچھ امیدیں ہوئیں اور مجھ کو اس سے پہلے بھی
آپ جیسے مخلصین کا جانا اور پھر مولوی محمد الیاس صاحب کا ساتھ
ہو جانا کامیابی کا یقین دلاتا تھا۔ علم غیب تو حق تعالیٰ کو ہی
مگر میرا قلب شہادت دیتا ہے کہ انشاء اللہ سب و فود سے
زیادہ نفع آپ صاحبوں سے ہوگا۔ بخدمت مولوی محمد الیاس
صاحب سلام مسنون !

دستور ہند میں قضاۃ کے تقرر کی کوشش ^{حکیم الامت} کو اس کا بڑا

خیال تھا کہ ہندوستان میں سابقہ دستور کے مطابق قضاۃ کا تقرر ہو جائے
اس کے لئے آپ نے پوری سعی فرمائی، پہلے تو حافظ محمد احمد صاحب (سابق
ہائیم ملہ سہ عالیہ دیوبند) کے ذریعہ مسٹر مانٹنگو وزیر ہند تک اس کی
ضرورت کی اطلاع پہنچائی اور پھر بعض ممبروں کو اسمبلی اور کونسل میں
اس مسئلہ کے پیش کرنے کی ترغیب دلائی اور بعض ذرائع سے یہ بات
”سائمن کمیشن“ کے سامنے بھی لائی گئی۔ اسی سلسلہ میں آپ کے ایما پر میرٹھ
میں انجمن نصاب القضاۃ قائم ہوئی جس سے ”القول الماضی“ وغیرہ کے

رسد شائع کر کے عوام میں اس کی اہمیت کا شعور پیدا کیا۔ پھر ۱۳۴۷ھ بمقام دہلی ایک جلسہ منعقد کروایا جس میں تمام ممبران اسمبلی اور عمائدین شہر کے علاوہ حضرت انور شاہ کشمیری اور مولانا محمد علی جوہر اور سہارنپور اور دیوبند کے بعض اور ممتاز علماء شریک تھے۔ خالقہ امدادیہ کی طرف سے مولانا عبدالکریم صاحب نے شرکت کی۔ اس جلسہ سے ممبران اسمبلی پر پیام قضاۃ کی اہمیت و ضرورت واضح ہو گئی۔ لیکن یہ ساری کوششیں نتیجہ خیز نہ ہو سکیں۔

آخری دور ۱۳۳۷ء تک ہندوستان کے اکثر مقامات اور شہروں میں پیغام حق کی منادی کر کے اب وقت آیا کہ آپ ہمیشہ کے لئے خالقہ امدادیہ ہی میں عزت نشین ہو جائیں فتی (Hermit) کا عارضہ لاحق ہوا۔ اطباء نے سفر کی قطعاً ممانعت کر دی۔ آپ نے اعلان فرمادیا کہ اب کوئی دعوت سفر نہ دے۔ اس طرح "فیلج مجھارا بٹ" و "استغفر" والا دور شروع ہوا اور اس اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق بھی میسر آئی، ویسے تا دم آخر زائرین خالقہ کو ملفوظات کے ذریعہ اور دوسرے طالبین کو مکتوبات کے ذریعہ ہر امر مستفیض فرماتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے چلنے پھرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی۔ ساٹھ برس کی جدوجہد اور صرف ہمت سے ہزاروں کی سیرتیں بن چکی تھیں، سینکڑوں "سیرت گم" تیار ہو چکے تھے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اپنی اپنی جگہ تبلیغ و رشد میں مصروف تھے! چنانچہ

راقم نے یہ روایت دو شاہد عادل سے سنی ہے کہ
 جب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا
 تعلق خاتقاہ اشرفیہ سے قائم ہو گیا تو خود حکیم الامت
 نے کئی بار فرمایا کہ "اب میرا کیا کام ہے بحمد اللہ اب مجھے
 اطمینان ہے کہ میرے مذاق کو سمجھنے والے اور اس کو
 پھیلانے والے موجود ہیں۔"

لے حاجی محمد عثمان خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فاکر عبدالحی صاحب مدظلہ

مربیانہ شان

ہزار نکتہ بار یک تر ز مو اینجاست

نہ ہر کہ نہ تیرا شد قلندر ہی داند

تربیت روحانی کوئی آسان کام نہیں حقیقی طبیب روحانی بڑا مشکل سے ملتا ہے عطائی اور دوکاندار مشائخوں کی البتہ کمی نہیں اور یہ انہیں کی کثرت کا نتیجہ ہے کہ درویشی کی تعلیم کے ابواب حال و قال عرس و چراغاں اور نذر و نیاز سمجھے جاتے گئے ہیں پھر اگر اس عجیبیت کو دیکھ کر اقبال مرحوم نے کہا۔ غ

”کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی“

تو کیا ہوا۔ اس میں مرحوم انتہا نہیں خود ہمارے اکابر کی زبان سے بھی ایسی خانقاہوں کے بارے میں اس سے زیادہ سخت الفاظ نکلے ہیں

یار بسیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد

تبخانہ کہ خانقہ نش نام کردہ اند

اور عراقی نے فرمایا غ ”چوبہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتہ ریائی“۔ ان اشعار میں ایسی ہی خانقاہ کو صومعہ اور تبخانہ سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ کچھلے کسی عنوان کے تحت ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان دوکانداروں کے فروغ اور

ان کے ہاتھوں خالق ہی تعلیم کے مسخ ہو جانے سے نفس خالق ہیت کا انکار لازم نہیں آتا کیونکہ یہ تو ہر جگہ اور ہمیشہ ہی ہوتا آیا ہے کہ غلط افراد کی وجہ سے اچھے ادارے بھی اپنا مقصود اصلی کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر ان کی اصلاح اسی طرح ہوتی رہی ہے کہ صلاحیت رکھنے والے افراد نے ان کی زمام اپنے ہاتھوں میں لے لی اور ان کو ہر عیب سے پاک کر دکھایا۔ حکیم الامتؒ نے بھی پھر ایک بار خالقاً کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا اور "سیرت ساری" کا وہ صحیح طرز اختیار فرمایا کہ جو کیا نہ صوفیت اور راہبانہ تربیت کے پردے تارتا ہو گئے، اسلامی روحانیت کا مفہوم کھل گیا اور اس کے پیکر نظر آنے لگے۔

آپ نے اس حقیقت
ظاہر و باطن دونوں پر شریعت حاکم ہے کو پورے زور سے
 ظاہر فرمایا کہ شریعت ہی ساری دنیوی و اخروی ظاہری و باطنی سعادتوں اور کامرانیوں کی کفیل ہے۔ اور اپنے اس دعویٰ کو مختلف دلائل سے ثابت کیا اور طرح طرح کی مثالوں سے واضح فرمایا چنانچہ محض ظاہر پر اکتفا کرنے والوں اور نہرے باطن کے دعویداروں کی اصلیت ایک وعظ میں یوں ظاہر فرمائی ہے:

”ایک جماعت نے روح کی طرف التفات نہیں کیا اور ایک نے صورت کی طرف لیکن پھر بھی ان دونوں میں تفاوت عظیم ہے جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا انہوں نے روح کا انکار نہیں کیا اور جنہوں نے صرف روح کو لیا انہوں نے

صورت کا انکار کیا نیز جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا وہ روح کو بالکل چھوڑے ہوئے نہیں ہیں یہ ایک بار ایک بات سمجھنے کے قابل ہے یعنی روح کے درجات طبقات ہیں جیسے انسان زندہ ہوتا ہے روح حیوانی سے اور اس کے مراتب مختلف ہیں مثلاً ایک پہلوان کی روح اور ایک مدقوق کی روح میں فرق و مدقوق بھی روح سے خالی نہیں گو روح ضعیف، سہی اسی طرح اعمال کی روح کو سمجھو۔ منکرین ظاہر کہتے ہیں کہ صورت کو لیکر بیٹھے ہیں؟ یہ معترض نادان نہیں جانتے کہ صورت محض نہیں ہے اس میں بھی روح ہے گو ادنیٰ درجہ کی سہی پس جس وقت نماز کی نیت باندھی وہی نیت نماز کی روح ہے چنانچہ اگر نیت نہ ہو تو روزہ صحیح نہ ہو خواہ دن بھر نہ کچھ کھائے نہ پیئے روزہ کی شرط نیت ہے اور نیت فعل القاب ہے جب نیت کی بس روح متحقق ہو گئی۔ معترض نے ہماری نماز و زکوٰۃ کو "پوست بے مغز" سے تشبیہ کی لیکن وہ غلط ہے اس کی تشبیہ ہے "پوست بے مغز کم روغن" مغز کم روغن ہے، سو کھا روکھا ہے مگر ہے ضرور! ایسا ہے کہ جتنا روغن اچھے مغز سے ایک سیر میں نکلتا ہے یہاں چار سیر میں پچھلے گالپس ان کے یہاں روح بلا صورت ہے اور ہمارے یہاں "صورت مع الروح الضعیفہ"

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن کو دعویٰ نری روح کہے

ان کے یہاں روح ہی نہیں، وہ لوگ بلا نماز کے جس کو روح سمجھتے ہیں وہ روح نماز ہی نہیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے تحقیق اس کی یہ ہے کہ بعض ارواح کے تحقق کے بعض شرائط ہوتے ہیں۔ قاعدہ عقلیہ ہے کہ بلا شرط کے مشروط نہیں پایا جاتا۔ نماز کی جو روح ہے یعنی توجہ الی اللہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ بدون نماز کی صورت کے نماز کی اس روح کا تحقق ہی نہیں ہوتا یعنی جب نماز میں توجہ الی اللہ فرما کی گئی تو اس سے ثابت ہوا کہ مطلق توجہ الی اللہ نماز کی روح نہیں مثلاً روح انسانی کے فیضان کے لئے بدن انسانی کا شرط ہونا معلوم ہے تو اگر کوئی گائے سامنے آجائے اور کہا جائے کہ اس کے اندر روح انسانی ہے تو اس کی کبھی کوئی تصدیق نہ کرے گا کیونکہ مادۃ اللہ یونہی اری ہے کہ روح انسانی کا جب تحقق ہوگا اسی قلب انسانی میں ہوگا پس معلوم ہوا کہ نماز کی روح نماز سے مجرور ہو کر کبھی پائی نہیں جاتی جو، قالب نہیں تو روح جس کا دعویٰ ہے وہ نماز کی روح ہی نہیں کسی اور چیز کی روح ہوگی چاہے روح نماز کے مشابہ ہو۔

اب ایک اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس طرح وہ نماز کی روح نہیں اسی طرح کسی دوسری چیز کی بھی روح نہیں پس کسی قسم کی روح نہیں۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ نماز کی روح - اللہ کی یاد - ذکر اللہ یا خلوص مثلاً عبادت کی روح محبت یا عشق، یہ سب جب پایا جائیگا

کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو، مطلق
 نہیں پایا جاسکتا کئی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جاسکتی، جس طرح کہ انسان
 جب کبھی پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا اب ہم
 دیکھتے ہیں کہ روح یعنی "توجہ الی اللہ" کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس
 شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عمل ظاہری کے ہو
 کیونکہ اس میں کوئی مشقت و کلفت و حجابہ ہی نہیں بلکہ مطلوب
 خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عمل ظاہری کے ہوں پس وہ توجہ الی اللہ
 ہی نہ پائی گئی پس ہم کہتے ہیں کہ کوئی روح ہی پائی نہیں گئی نہ نما کی
 نہ غیر نماز کی اور اگر کوئی عمل ظاہر کیلئے تو صورت کی حاجت ہو
 تو اے مدعی! وہی صورت کیوں نہیں قبول کرتا جو محبوب نے
 تجویز کی، ہم تو تیری نفی صورت کو جب جانتے جب تو تیری فرج
 کو لا کر کھڑا کر دیتا۔ جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزہ
 محبوب سے اچھی کون سی صورت ہوگی۔ "و عظم روح الارواح"

اسی وعظ میں یوں بھی فرمایا: دراصل بڑا وہ ہے جو متبع شریعت ہے،
 کیونکہ ولایت شعبہ ہے نبوت کا، جتنا کوئی نبی کے مشابہ ہوگا اتنا ہی وہ بڑا
 ہوگا۔

کسی شیخ سے تعلق ارادت اور

شیخ مرہبر ہے نہ کہ جنت کا ٹھیکہ دار اس کے ہاتھ پر بیعت مقصود
 بن گئی تھی لوگ مرید ہو کر کھڑے ہوئے تھے کہ بس شیخ جنت میں لے جائے گا

اپنے اعمال و اخلاق کو اسلامی سلسلے ڈھالنے کی فکر نہ کرتی تھی حکیم الامت نے اس غلط فہمی کو پوری طرح رفع کیا اور خوب کھول کر بتایا کہ شیخ جنت کا ٹھیکہ نہیں کہیں اس کے ہاتھ پہ ہاتھ دھرتے ہی جنت میں نشتر محفوظ ہو جائے بلکہ وہ رہبری کا ایک فرد ہے چلنا اور راستہ ملے کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کی سعی کرنا یہ خود مرید کا کام ہے چنانچہ فرمایا:

”بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر بخشش کے ذمہ دار ہو جائیں گے حالانکہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ تک کو فرمایا کہ فاطمہؓ اپنے کو دوزخ سے بچاؤ تو بھلا کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے جب تک خود مرید ہی اس کی کوشش نہ کرے بعضے چاہتے ہیں کہ پیر صاحب ایک نظر میں کامل کر دیں اگر اس طرح کام بن جائے تو صحابہؓ کو کچھ بھانہ کرنا پڑتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی گیا تو خوارق میں دوام و لزوم نہیں رہتا بھر دسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے“

یہی وجہ تھی کہ جب تک آپ کسی شخص کے اندر راہ حق پر چلنے کا جذبہ نہ پاتے تھے اور کچھ امتحان لے کر آ زمانہ لیتے تھے، اس کو بیعت نہ فرماتے تھے بلکہ اگر اس میں ضروریات دین کا صحیح شعور اور دینداری کا حقیقی تصور اور شریعت مطہرہ کا پورہ احترام نہ پاتے تو برسوں تک بیعت سے انکار فرماتے رہتے تھے اس احتیاط کے باوجود اپنا تجربہ یہ بتاتے تھے کہ ”اس کو دھوکہ

بجا کر لینے کے باوجود پھر بھی کوئی کھوٹا نکل ہی آتا ہے :

بیعت کے اصول
آپ پہلے مندرجہ ذیل شرائط پر بلا بیعت تربیت
کی ذمہ داری لیتے تھے :

(۱) قرآن مجید جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے

صحیح کرانا ہوگا۔

(۲) بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے اور بہشتی گوہرا اور اصلاح الکرم
اور قصد السبیل پڑھ کر یا سن کر اس کی پابندی کرنا ہوگی۔

(۳) میرے چھپے ہوئے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

(۴) ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ سے (جس کو میں تحریر کروں یا
طالب کی تجویز پر اجازت دوں) حاصل کرنا ہوگی اور جب تک مجلس بالان سے
خط و کتابت نہ ہو چکے براہ راست مجھے تعلیم کی استدعا نہ کی جائے :

ان شرائط پر جو شخص جب بھی پورا اترتا تو پھر اس کو بیعت فرما لیتے تھے۔

آپ کے حلقہٴ اہلادب میں وہ لوگ نہ آ سکتے تھے جن سے آپ کے قلب میں کسی
قسم کا حجاب ہو خواہ اس کی وجہ اختلاف طبائع ہو یا اختلاف مسلک یا دنیوی
وجاہت وغیرہ ورنہ غیر متشدد اور غیر متعصب غیر مقلدین کو بھی داخل سلسلہ
فرما لیتے تھے۔

مستورات کو بیعت کرنے میں زیادہ تنگی نہ فرماتے تھے لیکن شرط یہ تھی
کہ وہ اپنے شوہر یا شوہر نہ ہونے کی صورت میں کسی محرم سرپرست کی صریح
اجازت حاصل کر کے پیش کریں اس کے بعد پردے کے پردے اہتمام کے ساتھ

بیعت فرمالتے تھے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیعت کے وقت عورت کے کسی
محرم کو ضرور پاس رکھتے یا پھر اپنی اہلیہ یا کسی محرم بی بی کو اپنے پاس رکھتے
اور جب نیکیوں کے کرنے اور برائیوں سے بچنے کا عہد لیتے تو تاکید فرماتے:
"میں جو کچھ کہتا جاؤں تم بھی چپکے چپکے کہتی جاؤ پکار کر نہ کہو"

حالت سفر میں بجز عورتوں یا ایسے افراد کے جن سے مناسبت پیدا ہو چکی ہو،
کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ لوگ دوکاندار یا اور
سفری پیروں سے احتیاط کرنا سیکھیں۔

ایسے حضرات جو کسی صحیح سلسلہ سے متعلق ہوں اور اپنے شیخ کی وفات پر
آپ سے مکرر بیعت کے طلبکار ہوں ان سے یہ فرماتے: "پچھلی بیعت مع اپنی ساری
برکات کے بدستور قائم ہے، مجدد بیعت کی حاجت نہیں البتہ تعلیم طریقی کے
لئے حاضر ہوں" البتہ جب زیادہ اصرار پاتے اور طالب کی تسلی و تسکین اسی میں
پاتے تو کبھی کبھی بیعت بھی فرمالتے تھے ہاں جس کا سلسلہ صحیح نہ ہوتا اور کسی فاسق
کا مرید ہوتا تو اس کو ضرور بیعت فرمالتے لیکن پچھلے شیخ کی شان میں گستاخ سے
پھر بھی منع فرماتے کہ یہ راہ سراسر ادب ہی ادب کی ہے۔ ع

بے ادب محروم پائند از لطف رب!

تعلیم و تربیت میں آپ کبھی مرید کے

شیخ مرید کا تابع نہیں ہوتا تابع نہ ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ اس کو پاتا

تابع رکھتے تھے ہاں اس کے جذبات صحیح کی ہر طرح رعایت فرماتے تھے۔

آپ کو چونکہ فاروقیت سے حصہ وافر ملا تھا اس لئے طالب کی ادنیٰ

بدتمیزی پر اس کے خفیہ سے خفیہ کید پر سخت گرفت فرماتے تھے اور ایسی جرح کرتے تھے کہ خود وہ اپنے آپ اپنی کوتاہیوں کا معترف ہو کر آئندہ کے لئے اپنے مکائد نفس سے باخبر ہو جاتا تھا، جو مریدین محض فقہی سوالات پوچھتے تھے ان کو یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ "یہ مسائل کہیں اور پوچھیں" اس میں مصلحت یہ تھی کہ اس سے مرید کی توجہ اپنے نقائص سے ہٹ کر صرف مسئلہ مسائل میں صرف ہوتی ہے جس سے مقصد سبیت فوت ہوتا ہے۔

اتباع شیخ کا درجہ اتباع شیخ اصلاح باطن کی کنجی ہے، لیکن اس اتباع کے بھی حدود متعین ہیں، لیکن خود صوفیاء

کرام ہی کے بعض ارشادات سے بعض لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور دو کاندازوں کو تو حدود شریعت کے مسمار کرنے کا ایک تیشہ ہاتھ آیا، ان کو جب کسی نے ٹوکا کہ حرم شریعت کو ڈھا کر پھر اسلام کہاں باقی رہے گا تو فوراً ناخرانہ انداز میں کہہ اٹھے کہ میاں یہ طریقت ہے اور اس کا دستور یہ ہے کہ

بہ مے سجاده رنگیں کن گرت پر مغساں گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

حضرت تھانویؒ نے اس پر ڈکوپاک کر دیا اور اتباع شیخ کی حقیقت یوں

بیان فرمائی: "الاعتدال فی متابعت الرجال"

یہ اتباع نہ عقاید میں ہے نہ کشفیات میں، نہ جمیع مسائل میں، نہ امور معاشیہ میں، صرف طریق تربیت و تشخیص امراض و تجویز تدابیر اور ان مسائل میں ہو جہاں تعلق اصلاح تربیت باطن سے ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ لکھا جواز مرید و شیخ کے درمیان متفق علیہ ہو، اور اگر اختلاف ہو تو شیخ

مناظرہ کرنا خلاف طریق ہے اور امتثال امر خلاف شریعت ہے، ایسی صورت
 میں ادب جامع بین الادبین یہ ہے کہ علماء سے استفتاء کر کے یا اپنی تحقیق سے
 حکم متعین کر کے شیخ کو اطلاع کرے کہ میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے
 سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے مجھ کو کیا کرنا چاہیے، اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے
 تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے اور اگر وہ ترک کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی
 متابعت ہے، یہ معنی ہیں "اتباع کامل" کے یعنی جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو
 یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو یا جو عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ و مرید میں متفق
 علیہ ہو، تجویز کیا ہو، ان چیزوں میں اتباع کامل کرے، ذرا بھی اپنی رائے کو
 دخل نہ دے اور باقی امور میں اتباع مراد نہیں ہے "حکیم الامت نقوش و تاثرات" ص ۳۹
 یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ کوئی بزرگ جب کسی کو
اجازت شیخ کا درجہ اپنا خلیفہ بناتا ہے اور اس کو اجازت بیعت
 دیتا ہے تو اس سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ مجاز، شیخ کا ہر طرح قائم مقام اور
 کامل ہے اس خیال کی تردید مولانا تھانویؒ نے فرمائی جس سے ایک طرف عوام
 کی غلط فہمی دور ہو گئی اور دوسری طرف خود خلفاء و مجاہدین کو اپنے "کچھ ہوتے"
 کے خیال سے نکل کر اور زیادہ جدوجہد کی طرف راغب کر دیا:

"اجازت دلیل کمال نیست، بلکہ دلیل مناسبت است۔"

چنانچہ دستار فضیلت بعد فراغ کتب می بندند اگرچہ عالم

کامل نہ باشد۔ صرف مناسبت مدارایں رسم باشد، کمال

بفراغ و دراست۔"

ہر شیخ ولی نہیں ہوتا

اسی طرح عام طور پر لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مرشد ولی ہوتا ہے اور کسی کو خلافت ملنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کو ولایت بھی مل گئی، حالانکہ یہ ایک کھلی بات ہے کہ خلافت تو ایک انسان عطا کرتا ہے اور ولایت محض عطیہ ربانی ہے ایک سے دوسری کا کیا تعلق لیکن ہر حال ایک غلط فہمی عام ہو چکی تھی اس لئے مرشد تھانوی نے اسکی بھی اصلاح فرمادی اور سمجھایا :

”بعضے خاص لوگوں کو بھی شیخ اور ولی کا فرق معلوم نہیں ولی کہتے ہیں مقبول کو اگرچہ لٹھ اور جاہل ہو۔ اور شیخ کہتے ہیں فن دان کو اگرچہ وہ فاسق و فاجر ہو، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اگر شیخ متقی ہوگا تو اس کی تعلیم میں برکت ہوگی اگر متقی نہ ہوگا برکت نہ ہوگی لیکن چونکہ اکثر لوگوں کو اس کے معنی معلوم نہیں اس لئے شیخ کا ولی ہونا لوازم سے سمجھتے ہیں سو یہ غلطی ہے۔“

(الافاضات الیومیہ حصہ پنجم ص ۴۳۸)

اس مربی کامل نے طالب کے لئے چار باتیں ضروری و لازمی بتائی ہیں :

”طالب کے لئے چار

طالب کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں

دو بیعت سہیلہ اور دو بیعت کے بعد ہمیشہ تک، پہلی دو چیزیں ہیں اعتقاد و اعتماد اگر شیخ پر اعتقاد نہ ہوگا تو فائدہ نہیں ہوگا اعتقاد یہ ہونا چاہیے کہ اسکی تعلیم و تربیت میرے لئے سب سے افضح ہے دوسرے اعتماد ہونا بھی ضرور

ہے کیونکہ اعتماد نہ ہوگا تو اس کی تعلیم و مشورہ میں خلجان رہے گا اب دوسری دو جن کی ضرورت بیعت کے بعد ہے وہ ہیں اطلاع اور اتباع۔ کیونکہ بدوں اطلاع کے شیخ طالب کے لئے کوئی تجویز یا ترمیم کیسے کرے گا۔ اس لئے کہ ہر شیخ کا صاحب کشف ہونا اور صاحب کشف کے لئے ہر وقت کشف کا ہونا ضروری نہیں کہ بغیر اطلاع کے اس کو خبر ہو جایا کرے پھر اطلاع کے بعد اتباع ہے کہ جو کچھ شیخ نے بتایا ہے بس اس میں کمی بیشی نہ کرے اور اپنی رائے سے کچھ نہ کرے اور اگر امر شیخ کے اتباع میں دشواری ہو یا مشقت ہو یا ضرر دیکھے تو اس کی بھی شیخ کو اطلاع کرے وہ کوئی مناسب تجویز کرے گا (مقالات حکمت)

آپ کی مربیاء نہ شان اس سے عیاں ہے کہ آپ کے **نصف سلوک** بعض دو لفظی یا سہ لفظی جملے ایسے ہیں جو حکمت و معرفت کے دفتر اپنے اندر رکھتے ہیں اور جن کو پیش نظر رکھ کر راہ سلوک کی بیشتر گریہیں کھولی جاسکتی ہیں مثلاً فرمایا اور بکثرت فرمایا ہے:

” نصف سلوک یہ ہے کہ غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہوں اور اختیاری امور میں کوتاہی نہ کریں۔“

یعنی اگر کوئی امر اختیاری ہے (مثلاً نماز، روزہ، ذکر شغل وغیرہ) تو اس میں ہمت اور عزیمت سے کام لے خواہ اس سے دل بستگی ہو یا نہ ہو۔ اور خواہ اس میں دل جمعی رہے یا نہ رہے البتہ جو امور بندے کے اختیار سے باہر ہیں اور محض حق تعالیٰ کی دین میں (مثلاً یکسوئی، سرور یا رقت اچھے اچھے خواب یا القوار و تجلیات وغیرہ) ان کے پیچھے نہ پڑے۔ اور اس میں نکتہ یہ ہے

کہ یہ سب غیر اللہ ہیں اور جب بندہ ان کا طالب ہوتا ہے تو اللہ کا طالب کہا
رہا اسی لئے شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ نے
فرمایا :-

”طالب لذت طالب حق نہیں“

اسی طرح اعمال کے ترک و اختیار سے متعلق دو لفظ فرمائے جو لوح
ذہن پر نقش ہونے چاہئیں یعنی ہر عمل سے پہلے یہ سوچ لے کہ یہ
”مقصود ہے یا غیر مقصود“

اگر وہ مقصود ہے تو بہر نوع اس کو اختیار کرے اور اگر غیر مقصود
ہے تو بہر حال اس کو ترک کرے ہاں جو اعمال مقصود میں معاون ہوں ان
اختیار بھی بہ اعتبار حالت و ضرورت ضروری ہو سکتا ہے اور یہ شیخ کے
مشورہ سے ہونا چاہیے !
اسی طرح فرمایا :

”مجاہدہ کا اجر مشاہدہ سے زائد ہے“ (نقوش و تاثرات ص ۳)

بعض لوگ ذکر و شغل اور
مجاہدہ کا درجہ راہب و زائد کا فرق دیگر مجاہدات ہاں کو سب کچھ
سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو دائم کرنے اور اس کو قلب میں رچانے
بسانے کے ذرائع ہیں ان کو بالذات مقصود سمجھنا تعلیمات اسلامی کے مغاثر ہے
شیخ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

”مجاہدہ معالجہ ہے وہ مقصود بالذات نہیں، اس کو مقصود بالذات

سمجھنا یہ رہبانیت ہے پس راہب وہ ہے جو ان معالجات کو قربات سمجھے
باقی جو معالجہ کو معالجہ سمجھے وہ راہب نہیں ناہر ہے " (فیوض الخالق)

حکیم الامت طبیب حاذق تھے اس لئے
کیفیت و احوال کا درجہ طالبین کی توجہ کو ہمیشہ کیفیت و
احوال کی طرف سے ہٹاتے رہتے اور اصل مقصود یعنی "رضائے حق" کی
طلب میں منہمک رکھتے تھے، ارشاد ہے:

"اسرار و ذوقیات کے نعمت ہونے میں شک نہیں، اگر بدو و
طلب کے حاصل ہو جائیں تو شکر کرنا چاہیے مگر چونکہ مقصود و مطلوب
نہیں ہیں اس لئے ان کے درپے نہ ہونا چاہیے، حضرت حاجی صاحب
قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ ذوق و شوق و انس و غیرہ "حجبات نورانیہ"
ہیں اور حجبات نورانیہ "حجبات ظلمانیہ" سے اشد ہیں کیونکہ حجبات
ظلمانیہ کی طرف سالک متوجہ نہیں ہوتا ان کو خود دفع کرنا چاہتا ہے۔ اور
حجبات نورانیہ کی طرف متوجہ ہوتا اور التفات کرنے لگتا ہے جس کی وجہ
سے توجہ "مقصود اصلی" سے ہٹ جاتی ہے۔"

شیخ شیراز (سعدی علیہ الرحمہ) نے بھی اس حقیقت کو خوب واضح کیا

کیا ہے اور تنبیہ فرمادی ہے

خیالات نادان خلوت نشین

بہم برزند عاقبت کفر و دین

اصل شے حب شیخ و اتباع سنت ہے عارف کامل شیخ مجدد
الف ثانی قدس سرہ کے

اس قول کو حکیم الامت اکثر نقل فرماتے اور اس پر بہت زور دیتے تھے کہ:
حب شیخ اور اتباع سنت کے ہوتے ہوئے اگر لاکھ ظلمات
بھی ہوں تو وہ سب "الوار ظلمات" ہیں اور اگر ان میں ایک چیز کی بھی کمی ہوئی تو
پھر مارے الوار ظلمات ہی ہیں۔ ۴

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر و دست
بر صراط مستقیم لے دل کے گمراہ نیست

اس طریق کا دل قدم فنا ہے صوفیائے کرام کے دو گروہ ہیں
ایک کے نزدیک "فنا" ابتدا ہے
دوسرے کے نزدیک انتہا ہے حکیم الامت نے اس اختلاف کی حقیقت یوں
ظاہر فرمائی:

"اس طریق کا اول قدم فنا ہے جس میں یہ صفت نہ پیدا ہوئی
بس سمجھ لو کہ اس کو طریق کی ہو بھی نہ لگی اور یہ جو بزرگوں کا قول ہے کہ طریق
کا آخر قدم فنا ہے وہ بھی بالکل صحیح ہے اور اس سے مراد "کمال فنا" ہے۔
کیونکہ فنا کے بھی تو آخر درجات ہیں۔"

شیخ کی نظر ملکات پر ہوئی چاہیے نہ کہ افعال پر حکیم الامت
تربیت کا باب اس قدر وسیع ہے کہ سفر سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

اس لئے آخر میں اب ایک ارشاد درج کر کے اس عنوان کو ختم کیا جاتا ہے کوئی ماہر نفسیات یا شیخ کامل ہی اس کو سمجھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ آپ امراض روحانی کے کستفہر ماہر فن دان اور حاذق طبیب تھے، فرماتے ہیں: "میری نظر" ملکات "پر ہوتی ہے۔" افعال "پر نہیں ہوتی کیونکہ افعال تو ارادہ" بدلنے پر ایک منٹ میں درست ہو سکتے ہیں لیکن ملکات کی اصلاح ہونا برسوں میں بھی مشکل ہے۔"

اور یہ تو آپ کے ماہر نفسیات اور شیخ کامل ہونے کی چند مثالیں ہیں ورنہ "تربیت السالک" اٹھا کر نفسیاتی نقطہ نظر سے کوئی دیکھ لے تو اسکو اس زائد اٹھ ہزار صفحات کتاب کا ہر ہر صفحہ فنی نکات سے پر دکھائی دے گا اور جو کوئی "دیدہ ور" ہو تو اس کو ہر جملے سے درس معرفت ملے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت تھالوفی قدس سرہ جیسی ہستی کو ماہر نفسیات و فلسفہ کہتے ہوئے بھی شرم سی آتی ہے کیونکہ یہ تو ان گنی چنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے اقوال و ملفوظات سے علم فلسفہ و نفسیات کے اصول مرتب ہو سکتے ہیں۔

ترہیت یافتگانِ اشرفیہ

کسی درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا صحیح اندازہ وہاں کے فاضل شدہ طلبہ کی علمی استعداد اور عملی صلاحیت ہی سے ہو سکتا ہے صد فی صد تو نہیں مگر جس ادارہ کی اکثریت اچھی ہوگی وہ ادارہ لائق اعتماد سمجھا جائے گا ورنہ اس کی ساکھ جاتی رہے گی۔ "ترہیت گاہ اشرفیہ" کی وقعت و عظمت کے ثبوت میں اس نوع کی دلیل بھی بے کھٹکے پیش کی جاسکتی ہے۔ اشرفی درسگاہ میں صدیوں کے بھلائے ہوئے سبق اصلاح معاملات و معاشرات پر اس قدر زور دیا جاتا تھا کہ بغیر اس کے ذکر و شغل کی اجازت ہی نہ ملتی تھی اور جب ملجاتی تھی تب بھی اس کے بدو اس پر اکتفا نہ کیا جاتا تھا، حیرت ہے کہ سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پہلا ورخشاں پہلو جو اثبات نبوت کے لئے ایک کھلی دلیل ہے جس کے ہوتے ہوئے کافروں نے چاہے جتنی افتراء و زاریاں کی ہوں لیکن "امانت"، "دیانت" اور صفائی معاملات کا آخر وقت تک بھی انکار ممکن نہ ہوا بلکہ قوی انکار تو کیا ہوتا "عملی انکار" بھی نہ ہو سکا۔ اس کو تصوف سے صوفیائے سواق نے اس طرح الگ کر دیا گویا اسکی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ حالانکہ ہر عاقل جانتا ہے کہ درسگاہ محمدیہ

کے فارغین کرام نہ ہوا پر اڑے ہیں، نہ پانی پہ چلے ہیں، نہ انہوں نے
 بلا مشقت کسی دستِ غیب کے ذریعہ اپنا پیٹ پالاسے نہ انہوں نے
 "تصرفات" سے کسی کو زیر کیا ہے، اور نہ محض "تیغ و تفنگ" کے ذریعہ
 اپنی ساکھ جمائی ہے، مگر ہاں ان کا جو وصف امتیازی ہے وہ یہی کہ
 وہ بات کے پکے تھے۔ وعدے کے سچے تھے، حق کے معاملہ میں نہ تحریص
 ان کے قدم ڈگمگا سکتی تھی نہ تجویف سے وہ لرزہ برآمد ہوتے تھے اپنوں
 اور پرانیوں پر شفقت ان کا خاص شعار تھا ان کا پڑوسی، ان کی رعایا ان کے خدام
 اور ان کے ماتحت ان سے ایسے خوش تھے کہ اس سرپرستی کو بدل و جاں اپنے
 لئے باعثِ رحمت سمجھتے تھے وہ انفرادی حیثیت میں اور اجتماعی موقف میں،
 گھر کی چار دیواری اور ملک کی وسعتوں میں ہر اعتبار سے لائقِ اعتماد اور قابلِ
 تقلید تھے۔ اور یہی ان کی دنیوی کامرانی اور اخروی نجات کا سہارا تھا۔

حکیم الامت کا یہ کارنامہ بھی آپ کی "تجدیدی شان" کا ایک کھلا ثبوت
 ہے کہ آپ نے اس اہم پہلو کو جس کے بغیر انفرادی و اجتماعی صلاح و فلاح کا
 تصور ناممکن ہے، پوری طرح اجاگر کیا اور اس کو تربیتِ باطنی کا جز و لا ینفک
 قرار دیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے تربیت یافتوں اور ان کے نقش قدم پر
 چلنے والوں میں اس کا اہتمام اس درجہ نمایاں ہے کہ اب مدعیانِ تہذیب و
 اخلاق کو بھی انگشت نمائی کی گنجائش نہیں رہی ہے بلکہ اس دور میں جب کہ
 اور مقامات پر سیرت سازی کے اس پہلو سے تغافل ہے مسلکِ اشرفیہ کے
 پیروں کی کسوٹی ہی یہ بن گئی ہے کہ اس کو "معاظمت" کی بھٹی میں ڈال کر اڑنا

جائے جو پورا پورا نکھر آئے وہ اثر فی ہے اور جو اس میں جل جائے وہ کھوٹا
چاہے وہ پھر اپنی تائید میں کتنے ہی اسناد پیش کرے۔

اختصار کے مد نظر ذیل میں چند واقعات صرف ایسے افراد کے درج
میں جو نہ صرف یہ کہ مولوی ہی نہیں تھے بلکہ عام کتابی علم سے بھی نا آشنا تھے
اور اس کے باوجود ایسے محتاط تھے کہ اور جگہ کے صاحب علم حضرات بھی کم
اس درجہ پابند ہوں گے۔

(۱) الہ آباد کے ایک نائی تھے حضرت سے مرید ہوئے تو اپنا پیشہ محض
اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ اس میں اکثر مسلمانوں کی ڈالٹھیاں مونڈنی پڑتی تھیں
انہوں نے پکوان سیکھا اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اپنی دیانت داری
کی وجہ سے اس درجہ مقبول ہوئے کہ آمدنی بھی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی
اور ہر وقت عمدہ عمدہ غذائیں نصیب میں آئیں۔

(۲) فتحپور کے ایک معمار آپ کے مرید ہوئے تو اس کی بڑی احتیاط ہو گئی
کہ امانی میں بھی ویسی ہی تیز دستی سے کام کرنا چاہیئے جیسا کہ ٹھیکہ میں کیا جاتا ہے
اپنی اس صفت کی وجہ سے وہ وہاں کے صاحب علم حضرات کے لئے بھی
باعث رشک ہو گئے اور سب کی نظروں میں لائق عزت ٹھہرے۔

(۳) حکیم الامت کے ایک خادم کا قیام مدرسہ دیوبند میں ایک صاحب
کے ہاں ہوا جب رات ہوئی اور لائین آئی تو خادم نے پوچھا کہ آیا یہ مدرسہ کا
تو نہیں ہے؟ بس اس سوال پر ایک عمر بزرگ نے ان سے پوچھا کیا تم کو مولانا
تھانوی سے تعلق ہے؟

(۴) اسی طرح ایک طالب علم کسی مسجد میں مسجد ہی کے چراغ سے مطالعہ کر رہے تھے۔ جب چراغ گل کرنے کا وقت آیا تو فوراً اس کو گل کر کے اپنا چراغ جلایا ایک اعلیٰ عالم نے اس حرکت کو دیکھ کر وہاں کے لوگوں سے کہا: "معلوم ہوتا ہے اس کو مولانا تھا تو ہی سے تعلق ہے" چنانچہ تحقیق پر یہ بات سچ نکلی۔

دہا یہ حال جب غیر پڑھے لکھوں کا ہو گیا تو جو تعلیم یافتہ تھے ان کا پوچھنا کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے بی، اے، اور ال، ال، بی کی سند علیگڑھ سے حاصل کی اور وکالت کو ذریعہ معاش قرار دیا مگر حکیم الامت کے تعلق نے کچھ ہی عرصہ میں اس پیشہ سے موصوف کو متنفر کر دیا اور کسبِ طیب کے خیال سے ہوسو پختی کی تعلیم حاصل کی اور بحمد اللہ کہ ۳۰ برس سے ایک کامیاب ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

(۵) ایک واقعہ اس تربیت گاہ کے ایک اور قدیم نعتیہ فتنہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کا بھی سنئے۔ ایک دفعہ سفر پر جا رہے تھے اسٹیشن پنچکر اسٹیشن ماسٹر سے خواہش کی کہ سامانِ تلوار اس کا محصول بتائے؛ اسٹیشن ماسٹر نے تساہل کی بنا پر انکار کیا۔ خواجہ صاحب مصر ہوئے اسے کیا خبر کہ یہ بھی کوئی بی، اے، ال، ال، بی (علیگ) ہیں اس گمان سے کہ ملا آدمی ہیں کچھ حکمانہ انداز سے زور دیا کہ بلا اسباب تلوائے چلے جائیں خواجہ صاحب کو غصہ آگیا اور انگریزی زبان میں اس کو خوب لتاڑا کہ کمپنی نے تم کو معافی کا حق کب دیا تھا؟ اور فرمایا کہ ابھی بددیانتی کی رپورٹ کئے دیتا ہوں! اس پر وہ بڑا پریشان ہوا اجاجت سے

معافی چاہی اور فوراً سامان تلو اکر حسب ضابطہ محصول وصول کیا۔ اس نے
اصول کا ایسا پابند شاید پہلا ہی انسان دیکھا ہوگا !

مریدوں میں یہ اثر نہ صرف حضرت شیخ کی نگرانی و تربیت کا نتیجہ تھا
بلکہ خود آپ کے عمل مستحکم کا باعث بھی تھا۔ جس کے کئی واقعات گزر چکے، اور
جو کھے جا چکے ہیں وہ کل کا ایک ادنیٰ جز بھی نہیں۔ یہاں موقع کی مناسبت سے
ایک اور واقعہ درج ہے جس میں ہر مسلمان کے لئے عبرت ہی عبرت ہے۔

ایک مرتبہ آپ سہارنپور سے تشریف
لے جا رہے تھے، کچھ گنے ساتھ تھے

ایک عبرت آموز واقعہ

آپ نے ضابطہ کے تحت ان کو تلوانا چاہا تو اسٹیشن کے غیر مسلم ملازمین نے
ازراہ عقیدت عرض کی "آپ یونہی لے جائے تلوانے کی ضرورت نہیں ہم
گارڈ سے کہہ بیگے" آپ نے فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟ انہوں نے
عرض کیا "غازی آباد تک" ارشاد ہوا "غازی آباد سے آگے کیا ہوگا؟ عرض
کی "یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا" آپ نے پھر سوال کیا "پھر آگے کیا
ہوگا؟" جواب ملا "ہاں کا نیو تک پہنچا دے گا اور وہاں آپ کا سفر ختم ہوگا۔"
اس پر مجدد ملت نے فرمایا "نہیں وہاں سفر ختم نہیں ہوگا بلکہ آگے ایک اور
سفر آخرت کا بھی ہے وہاں کا کیا کیا انتظام ہوگا؟"

بس یہ سن کر سب دنگ رہ گئے کہ ایسے بھی محتاط بندے ہوتے ہیں جو
خدائے تعالیٰ سے اس قدر ڈرتے ہیں اور اپنے ہر عمل میں مسئولیت کے تصور
کو اس درجہ مستحضر رکھتے ہیں !!

حکیم الامت کے اس عمل و تلقین اور مریدوں میں اس کے اہتمام کا
نتیجہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص تھا نہ بھون اسٹیشن پر اترتا تھا تو اس سے
ریلوے والے پوچھتے تھے کہ سامان تلوا یا بھی یا نہیں؟ اور اس کا
محصول ادا کیا بھی یا نہیں؟ سب یہی کہتے تھے کہ یہ تھا نہ بھون والے مولانا
صاحب کے پاس جا رہے ہیں اور وہاں جانے والے بلا اسباب تلوائے
سفر نہیں کرتے۔ غیر اقوام پر مسلمانوں کی ساکھ اسی طرح قائم ہوتی ہے۔ اورو
اسی صفائی معاملات کے ذریعہ قائم رہ سکتی ہے، مگر شب و روز نے ہزاروں
کر وٹیں بدلی ہوں گی کہ تادانوں اور نفس پرستوں نے اس اہم باب کو کتاب
تصوف سے "یکسر محو کر دیا تھا۔ حکیم الامت نے پھر اس کو داخل نصاب کیا۔
اور اپنے شاگردوں پر اس پرچہ کو لازمی قرار دیا!!!

یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ جہاں اور جگہ کے مریدوں میں
وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود و لطائف اور الوان، سیر اور طیران وغیرہ کا
چرچا پایا جائے گا حکیم الامت کے متعلقین میں اس کے برعکس حلال و حرام کی
تمیز ادائی حقوق کا پاس صفائی معاملات کا لحاظ اور احتساب نفس کی گرم جوشی
ملے گی!

حق تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ کے منتسبین اور معتقدین اس امتیاز کو ہمہ
قیمت باقی رکھیں۔

کرامات

کرامات گویا بندگی کا لازمیہ بن گئی ہیں حالانکہ اگر یہ حقیقی ہوں تو بھی کسی کی اختیاری نہیں اور جب غیر اختیاری اور محض عطائی ہیں تو اس پر کسی کی بزرگی کا مدار کیوں ہو؟ بندہ اختیاری امور کا پابند ہے اور انہی امور کی پابندی اور تکمیل اس کے لئے وجہ بزرگی ہے۔ پھر اصطلاحی کرامات سے زیادہ ایک اور ہم بات ہے جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قولِ محکم سے ثابت ہے، وہ ہے فرستہ مومن اتقوا قرستہ اطمون فاندہ نیتونود اللہ (مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) یہ صفت غیر مومن سے میل نہیں کھاتی کیونکہ اس کی اسل ہے "نور الہی" جو اتباعِ سنت سے بڑھتا اور پیرویِ نفس سے مٹتا ہے کفر کے ساتھ اس کا اتصال ناممکن ہے۔

فان العلم نور من اللہ و نور اللہ لا یعطی لعاصی (ام شافعی)

(علم حق تعالیٰ کا ایک نور ہے اور حق تعالیٰ کا نور کسی گنہگار کو عطا نہیں ہوتا) لیکن اس نورِ ربانی کی جو انبیاء علیہم السلام کو بدرجہ انم اور ادیبائے کرام کو حسب مراتب حاصل ہوتا ہے، لوگوں کے ذہن سے اہمیت نکل گئی اور کشف کرامات کے پیچھے پڑ گئے جس کی پہچان بھی مشکل ہے اور جو بہ اعتبارِ ظہور اور کشف سے

ایک ممکن ہے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اگر آجکل کی اصطلاحی کرامات
 ہی بزرگی کا معیار ہیں تو جتنی کرامات آج کسی ادنیٰ ولی کی جانب اس کے
 معتقدین منسوب کرتے ہیں کیا اس کا عشر عشر بھی صحابہ کرام کی میر توں میں
 ملتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس معیار کی کیا حقیقت رہ
 جاتی ہے چنانچہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:-

ظہور خوارق نہ از ارکان ولایت است و نہ از شرائط آن
 و کثرت ظہور خوارق بر افضلیت دلالت ندارد۔ تفاہل
 آنجا بہ اعتبار درجات قرب الہی است جل سلطانہ۔ تواند
 بود کہ از دلی اقرب ظہور خوارق اقل باشد از اں بعد اکثر
 خوارقے کہ از بعضی ادبیاع امت بظہور سیدہ انداز
 اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین عشر عثمان
 بظہور نیامدہ بہ آنکہ افضل ادبیائے است بر مرتبہ ادنیٰ
 صحابی نمی رسد۔ و ہم چنین انداد بیائے متقدمین این قدر خوارق
 نقل کردہ اند کہ از متاخرین۔ مثلاً جنید کہ سید این طائفہ
 است معلوم نیست کہ ازوے وہ خوارق نقل کردہ باشند۔

(مکتوبات)

پس معلوم ہوا کہ اصل کرامت و بزرگی اتباع سنت کی تکمیل اور
 اس پر استقامت ہے کیونکہ ولایت شعبہ ہے نبوت کا اور جو جتنا نبی صلی اللہ
 علیہ وسلم کے مشابہ ہوگا اتنا ہی بڑا ہوگا خواہ اس سے ایک خرق عادت بھی

سرزد نہ ہو صوفیائے ربانی کا قول مشہور ہے "ا کا استقامت فوق الکرامتہ
 (شریعت پر استقامت ساری کرامات سے افضل چیز ہے) انہی وجہ سے
 حکیم الامت نے اپنی سوانح میں اس باب ہی کے حذف کرنے کا حکم دیا اور جو
 واقعی کرامات تھیں ان کو "الغامات الہیہ" کے غیر مبہم الفاظ سے تعبیر فرمایا ہیں
 یہ بات کھل گئی کہ اس میں بندہ کے کسب کو دخل نہیں بلکہ یہ خصوصی عنایات
 ہیں جو محبوب کی طرف سے محب پر ہو جاتی ہیں کہ دوسروں سے اس کا کیا تعلق
 چنانچہ بزرگانِ دین نے تو اپنے کشف و کرامات کو اس درجہ چھپایا ہے جیسے
 کوئی حائضہ اپنے حیض کو چھپاتی ہے اور ان سے بچنے کی دعائیں مانگیں ہیں اور
 اس کی وجہ عارف باللہ حضرت عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ سے سنتے فرماتے ہیں:
 "کشف کو لوگ پسند کرتے ہیں حالانکہ اس میں بڑی مضرت ہے
 خود دلی کے لئے بھی اور اس کے لئے بھی جو دلی سے اس کا طالب
 ہو۔ دلی کے لئے تو یہ ضرر ہے کہ اس میں مشاہدہ حق سے
 مشاہدہ خلق کی طرف اترنا پڑتا ہے اور یہ بالامقام سے
 پستی کی طرف انحطاط ہے اور طالب کا ضرر ہے کہ کشف
 و کرامات کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت اور پیروی ہوتی ہے۔"

اے بعض صوفیاء کا قول ہے کرامات اولیاء اللہ کا حیض میں "مطلب یہ نہیں کہ کرامات حیض کی
 طرح ارذل ہیں بلکہ یہ کہ حیض کی طرح وہ لائق اخفا ہیں اور ان کا اظہار اتنا ہی شرمناک ہے
 جتنا کہ حیض کا اظہار ایک حائضہ دوشیزہ کے لئے؛ (مولف)
 سنہ دیکھو تبریزی (ترجمہ ابرینی) ص ۲۸ از مولانا عاشق الہی میرٹھی

حکیم الامت کو "فراست مومن" سے حصہ

حکیم الامت کی کرامات وافر ملا تھا جو آپ کی بزرگی پر شاہد ہے اور

جس کا اندازہ گزشتہ ابواب کے حقائق سے بخوبی ہو سکتا ہے آپ کی کرامات تو آپ کے "آثار علمیہ" اور نقوش عملیہ ہی ہیں جن سے تجدید دین کا مہتمم بالشان کام ظہور میں آیا۔ لیکن ساتھ ہی آپ کی بابرکت ذات سے بیسیوں نہیں سینکڑوں واقعات ایسے بھی ظاہر ہوئے جن کو عام طور پر کرامات کہا جاسکتا ہے اور جس کی صحیح اصطلاح "النعامت الہیہ" ہے ان میں سے صرف چند بفحوائے مشغلے ازخروارے درج ذیل ہیں تاکہ جن کی تشفی "معنوی کرامات" سے نہ ہوتی ہو ماسی سے مطمئن ہو جائیں۔

وقت میں برکت آپ کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی جس کی بنا پر آپ تنہا وہ خالص علمی و فنی کام کر گئے

جو اتنی مدت میں ایک متحدہ جماعت سے بھی مشکل ہی سے انجام پا سکتا ہے اسکی ایک صورت تو یہ ہوئی کہ آپ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو بہت جلد شفا یاب ہو جاتے تھے دوسرے یہ کہ جس مضمون یا مسئلہ کی تلاش ہوتی غیب سے اس کے سلمان مہیا ہو جاتے تھے مثلاً مشرح مثنوی لکھتے وقت کبوتر بازوں کے ایک معمول کے معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی، ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ایسے میں ایک کبوتر باز تعویذ لینے آیا اور اس سے وہ بات معلوم ہو گئی ایسے ہی یہ بھی غیب سے انتظام ہوتا ہے کہ جس روز خطوط کی بھرمار ہوتی تو اس روز تعویذ مانگنے والے یا تو آتے ہی نہیں

یا بہت کم آتے تھے لہ

ایک جن کا دفعیہ برادری کی ایک بی بی پر جن کا آخر ہوا۔ تعویذ کی درخواست
آئی چونکہ آپ عامل نہ تھے اور آثار سے جن کا
قوی ہونا معلوم ہو گیا تھا اس لئے عذر فرما دیا لیکن جب اسرار زیادہ ہوا تو
جن کے نام ایک خط تحریر فرمایا:

”اگر تم مسلمان ہو تو میں تم کو قرآن و حدیث کی وہ وعیدیں
یاد دلاتا ہوں جو کسی کو ستانے پر وارد ہوئی ہیں اور اگر تم
کافر ہو تو اول ہم صلح کی تحریک کرتے ہیں اور اگر تم نہیں ملتے
تو یاد رکھو کہ ہم میں بعض ایسے بھی ہیں جو تمہارا پورا پورا انشاء اللہ
استیصال کر سکتے ہیں۔“

جب یہ خط اس جن کو سنایا گیا تو اس نے کہا۔
”یہ ایسے شخص کا خط نہیں کہ اس کا کہنا نہ مانا جائے اچھا لو
میں جاتا ہوں۔“

ایک شخص کا نام ”کلیم اللہ“ تھا وہ ہمیشہ
بیمار کا تندرست ہونا کچھ نہ کچھ بیمار رہتا تھا آپ کے پاس آیا

لہ تعویذ و عملیات سے حضرت کو کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ اس کو پسند بھی نہ فرماتے
تھے لیکن محض شیخ کے تابع شرعاً جائز اعمال لکھ دیتے تھے چنانچہ اعمال قرآنی کے نام سے
ہر سب یکجا اور ہر ایک کیلئے عام کر دیئے گئے ہیں اس میں کوئی بات راز کی ہے نہ اجازت
کی طالب! (مؤلف)

تو آپ نے اس کا نام بدل کر "سلیم اللہ" رکھا جس کے بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا
اس تبدیلی نام کی وجہ خود آپ نے یہ بیان فرمائی کہ "کَلِمَہ" کے معنی ہیں "جراحت"
اس لئے اس کا نام بدل دیا!

غبنی ذہین ہو جانا ایک صاحب کا لڑکا معمر ۹ ادس برس بہت غبنی تھا
آپ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے مزاحاً و تفریحاً
اس کا سر اپنے سر مبارک سے ٹکرایا بس اس کے بعد اس کا ذہن تیز ہو گیا۔

یہ تو روزانہ ہی کا معاملہ تھا کہ جو کوئی اپنے
سوال سے پہلے جواب ذہن میں اشکال یا غلط خیالات لے کر آتا

اس کے اظہار سے قبل ہی وہ اس کا جواب پا کر مطمئن ہو جاتا اور مجلس سے اٹھتے ہوئے
اپنے ذہن کو صاف کر چکتا تھا۔ مثلاً ایک واقعہ استاذی مولانا عبدالجبار صاحب
حیدر آبادی رحال خطیب لال مسجد عقب بولٹن مارکیٹ کراچی کا سنئے۔

دارالعلوم دیوبند میں پڑھ رہے تھے ابوالکلام صاحب کی تقریر و تحریر

سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیشتر وقت اہلال کے نوک زبلاں کرنے اور
سیاسی رنگ ڈھنگ اختیار کرنے میں مصروف ہونے لگا اسی دوران میں
پہلی مرتبہ اور طلبہ کے ساتھ تھا نہ بھون حاضری ہوئی، صاحب دل شیخ کی
نظر نے شاید اس جوہر کا اندازہ بھی لگایا اور اس پر جو گرد جم رہی تھی اس کو بھی
دیکھ لیا۔ مولوی صاحب کو بالا کر اپنے بالکل برابر شانہ بہ شانہ بٹھایا اور طالب علمی
کے زمانہ میں سیاسیات سے دلچسپی کی مضرت پر تقریر فرمائی اور تمام تر انہی کے
خیالات کی تردید کی اور اس دوران میں مزاحاً ان کے سر کو اپنے سر مبارک سے

ٹکرایا بھی۔ صاحب واقعہ کا بیان ہے کہ اس دن سے ان کو نہ صرف سیاسیات سے نفرت ہو گئی بلکہ ہلیم دین سے اس درجہ شغف بڑھا کہ پھر وہ مدرسہ کے اعلیٰ امتحان میں سب طلباء پر فوقیت لے گئے۔

کشف حال حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی احقر نے سنا کہ ایک مرتبہ مفتی صاحب کو دو سو روپیہ قرض ہو گیا تھا اور ادائیگی کی فکر لاحق تھی، ایک موقع ایسا آیا کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو قرض ادا ہو جاتا لیکن عین انہیں دنوں میں تھانہ بھون جلنے کا قصد تھا، اسلئے ہمت کر کے حکیم الامت کی خدمت میں حاضری ہی کو ترجیح دی، یہ وہ زمانہ تھا کہ مفتی صاحب ہمدرد کو ابھی محفل میں کلام کی اجازت نہیں تھی چہ مفتی صاحب تھانہ بھون تشریف لائے اور سلاک کے بعد مصافحہ کیا تو حکیم الامت نے انکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تین مرتبہ جوش سے فرمایا "دو سو روپیہ بھی کوئی چیز ہے" علماء کے جوتوں کی گرد ہے! بس اس جملہ سے مفتی صاحب کی ساری ذہنی کاوش رفع ہو گئی!

تھانہ بھون میں علیگڑھ میں پایا جانا

علیگڑھ میں حکیم الامت کے ایک معتقد نے نمائش میں دوکان لگائی تھی ایک روز عین فروخت کے وقت ان کے قلب میں وحشت سی شروع ہوئی اور انہوں نے نقصان کا خیال کئے بغیر سامان قبیل از وقت سمیٹنا اور صندوق میں بھرنا شروع کیا صندوق بھر چکے تھے کہ نمائش میں آگ لگ گئی ان کو پریشانی ہوئی کہ اکیلے ایسے زر فی صندوق کس طرح اٹھائے جائیں۔ عین اس پریشانی میں دیکھا کہ حکیم الامت آئے ہیں اور فرما رہے ہیں "جلدی کرو"

چنانچہ ایک طرف سے مالک دوکان اور دوسری طرف سے حضرت شیخ نے پکڑ کر
ایک ایک صندوق کر کے سارا سامان بچا لیا جب سامان اٹھ چکا تو حضرت
وہاں سے غائب تھے اور درحقیقت اس وقت آپ تھانہ بھون میں تھے
جب آپ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا تو فرمایا :

”مجھ کو اس کی کچھ خبر نہیں البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ
کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت سے فرماتے ہیں کہ
کسی لطیفہ غیبیہ کو کسی مالوس شکل میں ظاہر فرمادیا اور
اس کے ذریعہ سے اس کا کام بنوادیا اور خود اس شکل
والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔“

یہ بھی آپ کی بڑی برکت ہے کہ
آپ کے متوسلین کو ”حسن خاتمہ“

آپ کے مریدین کا خاتمہ بخیر ہونا

کی دولت ملتی رہا ہے، جو ہر دولت سے بالاتر ہے حضرت خود بھی فرماتے تھے :

حضرت حاجی صاحب کے سلسلہ کی یہ برکت ہے کہ جو بلا واسطہ

یا بالواسطہ حضرت سے بیعت ہو اس کا بفضلہ تعالیٰ خاتمہ

بہت اچھا ہوتا ہے حق تعالیٰ ہر مسلمان کو حسن خاتمہ کی نعمت عطا فرمائے

یہ عنوان اتنا وسیع ہے کہ ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے مگر چونکہ ملک

اشرفیہ میں اس کو اتنی اہمیت نہیں اس لئے اس اختصار ہی پر اس کو ختم کر دیا

جاتا ہے۔ حق بھی یہی ہے کہ کرامات کی حیثیت غارہ کی سی ہے اور قبول عارف

شیرازی ۵ بہ آب درنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

باب چهارم

مسلك اشرفيه

اعتدال

یہ کیا حال ہو گیا ہے کہ جد ہر نظر اٹھتی ہے افراط ہی افراط ہے یا پھر تفریط ہی تفریط، اعتدال کی تلاش میں نظر حیراں و در ماندہ رہ جاتی ہے ایک طرف ترقی کا یہ عالم کہ انسانی آنکھ میلوں دور تک دیکھنے لگی۔ کان دنیا کے ہر گوشہ کی خبر سننے لگے، اس کے دسترس میں بہتی ہوئی ہوا اور ٹھانڈے مالتا ہوا سمندر بھی آگیا اس کے ذہن نے شمس و قمر کے فاصلوں کو ناپ لیا اور وہاں کی کیفیت کو بھانپ لیا۔ مگر رخ کو ذرا دوسری طرف پھیر کر دیکھئے کہ اس کے قلب سے احترام انسانیت مٹ گیا، نرمی و مروت جاتی رہی۔ دوستی و دشمنی، حق پسندی و حق شناسی کے جواہر اس نگینے سے نکل گئے، اب دوستی ہوگی تو ایسی کہ دوست کی خاطر دینا تک قربان ہو سکے گا اور دشمنی ہوگی تو ایسی کہ پھر مخالف کی نیکی بھی خیانت سمجھی جائے گی۔ کسی کی مدح سراہی ہوگی تو عرش و فرش کے قلابے ملا دیے جائیں گے۔ اور اگر کسی کی رد میں قلم اٹھے گا تو اس کی عزت و آبرو معرض خطر میں آجائے گی۔ لیکن خیر اس عالم بے اعتدالی میں خال خال ایسی ہستیوں بھی ملیں گی جن کا قدم اعتدال کے پل صراط پر ڈگمگایا نہ ہوگا۔ جن کی نظر نے اپنے اور پرانے موافق و مخالف کے عیب و ہنر دیکھنے میں قصور نہ کیا ہوگا اور جن کا قلم تنقید و تبصرہ میں مبالغہ و غلو سے بچ کر نکلا ہوگا، اسی صفت

”اعتدال“ سے متصف ہستیوں میں ایک اعلیٰ نمونہ حکیم الامت کی ذات ہے، یہ آپ کی معتدل مزاجی کا ایک کمرشمہ تھا کہ ہر بات کا مقام و محل پہنچاتے اور اس کے مطابق طرز عمل اختیار فرماتے تھے۔ روزانہ کی بات تھی کہ ابھی کسی زیر تربیت کی غلطی پر غضبناک ہو رہے ہیں اور اس درجہ اظہار غضب ہو رہا ہے کہ شاید اب جو بھی آئے اس عتاب سے بچ نہ سکے گا، مگر نہیں، عین اس حالت میں جب کوئی شخص لائق التفات و شفقت آ جاتا تو سارا غضب، محبت و شفقت میں بدل جاتا اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ ابھی گرج رہے تھے برس رہے تھے اور ابھی مسکرائے کھلکھلانے لگے یعنی آپ ”ابوالحال“ تھے، چنانچہ گزر چکا کہ ایک اہلیہ کے پاس ہوتے تو دوسری کا قصور تک نہ پاتا، یہ کمال بہت کیا ہے۔

آپ نے اپنے اور پیروں کو قرآن و حدیث کی میزان میں تولاد اور جو جتنا اترا ہے اس کا حق ادا کیا ہے ان کی طبعی و حلی مجبوریوں، ذہنی و فکری خطاؤں، حالی و مقامی لغزشوں کی حدود و شرع کے اندر تاویلات کی ہیں اور حسن ظن کی تلقین فرمائی ہے اور ان کی جو باتیں دائرہ شریعت میں نہ آ سکیں ان پر سکوت کیا ہے البتہ جو چیزیں حرم شریعت سے ٹکرائیں ان کا صاف صفا رد کیا، مگر صاحب قول پر لعن طعن اور سب و شتم سے پھر بھی گریز کیا ہے۔ یہ آپ کی سیرت کا اعلیٰ ترین وصف ہے اعتدال کے اس پل صراط پر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

آہستہ کہ رہ بر سر تنخست قدم را

آئندہ عنوانات میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے اسی میانہ و معتدل
 مسلک کی وضاحت ہوگی اور دکھایا جائے گا کہ کس طرح ہر معاملہ میں آپ نے
 نہایت محتاط، غیر دل آزار لیکن مستحکم پہلو اختیار فرمایا ہے خود فرماتے تھے
 کہ انسان کو رشیم کا ر سا ہونا چاہیے کہ پکڑے تو نہ نہایت نرم لیکن توڑنا چاہے تو
 ہاتھی کے زور سے بھی نہ ٹوٹ سکے، یعنی کہ مسلک و مشرب میں تو نہایت سخت ہو
 لیکن اس کی تلقین و اشاعت کا وہ ڈھنگ اختیار کرے کہ کسی مخالف کا بھی دل
 مجروح ہونے نہ پائے کیونکہ جب تک دل سے دل نہ ملے گا اثر و فیضان کیسے
 ہو سکے گا؟ تبلیغ دین کا یہ ایک ہم ترین نفسیاتی نکتہ ہے جس کی اصل قرآن حکیم کے
 اس ارشاد میں ملتی ہے کہ :

”کفار کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو“

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ فرقانِ حمید کا کام ہی یہ ہے کہ کفر و ایمان،
 گمراہی و ہدایت اور ظلمت و نور کو ہمیز کر دکھائے،

مولانا تھانویؒ کی اعتدال سنی کی عمومی نظر

از حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی

افراط و تفریط سے ہٹ کر زندگی کے جس مسئلہ پر اور جس شعبہ میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے، تو اچانک معلوم ہو گا کہ آپ تنہا لوگئے۔ اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اکثریت عموماً نقطۂ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے، ایسی صورت میں "اعتدال" پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو۔ ہاں ہوں تو تھوڑے بہت آدمی ہوں۔ یہ تعجب کی بات نہ ہوگی، آج کتنے ہیں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس الشمرہ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے :

۱۔ حضرت مولانا مناظر حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ "کمالات اشرفیہ" در جو مولانا محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے جمع کردہ ملفوظات اشرفیہ ہیں، لگی ہیں اس ایک کتاب ہی سے چند جواہر چن کر یہ مضمون تحریر فرمایا تھا جو پہلے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں ادھر پھر ماہنامہ مستقبل (کراچی) بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا، مناسبت کی وجہ سے اور تخط اشرفیہ کے طور پر اب شریک کتاب کر دیا گیا ہے (مؤلف)

(۱) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا ضوابط و قوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے۔ اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں۔ خیال یہ کر لیا گیا ہے کہ رو رعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا۔ مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے۔ خود مولانا کا حال یہ تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی ادھر ادھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے بعض سختی پسندوں نے عرض کیا کہ حضرت کی مجلس میں اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی کہا کہ بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے کہ مشائخ و صوفیہ کی مجلسوں میں حقائق و معارف کے سوا ادھر ادھر کی علم خبروں کا ذکر و اذکار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا نے فرمایا:

کوئی میرے پاس آکر بات کرے اور میں منہ موڑ لوں تو اس کو صدمہ ہوگا۔

پھر اپنی معتدل فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

”زائد اذکار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے۔“ (کمالات اشرفیہ ص ۳۷)

یہ آخری الفاظ مولانا تھا تو ہی کے ہو سکتے ہیں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ جائیں گے مگر کیا کیجئے کہ یہی واقعہ ہے، لوگ اس کا خیال نہیں کرتے کہ خود اعلیٰ خلق اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اس باب میں کیا تھا۔ معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی ہے اور آپ سنتے رہتے ہیں، کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا؟

مولانا ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کا بھی مذاق تھا کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے، ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ مقصود یہی تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو بے رخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جو عموماً موجب دل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت صحابہ کرام کیا بیان کرتے تھے۔

يُضْحِكُ مِمَّا يَضْحَكُونَ وَيَتَعَجَّبُ مِمَّا يَتَعَجَّبُونَ

”لوگ جن باتوں پر ہنستے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر ہنستے جن باتوں پر

لوگ تعجب کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم، بھی تعجب فرماتے“

دل شکنی کا خیال یہاں تک تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ خود بھی نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ وہی نہ چھوڑ دیتا کسی سے رخ نہ پھیرتے تھے۔ جب تک وہی نہ پھیر لیتا۔ خود حکیم الامت قدس اللہ سرہ اپنا ایک خواب بیان فرماتے تھے کہ ملکہ وکٹوریہ جس زمانہ میں زندہ تھی، آپ نے خواب میں اس کو دیکھا۔ ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں اور نہ ہاگ نظر آتی تھی (موٹر) کا اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی، بہر حال خواب میں معلوم ہوا کہ مولانا سے کہہ رہی ہے کہ ”اسلام ہی حق مذہب مجھے معلوم ہوتا ہے، البتہ ایک شبہ مجھے ہوتا ہے، کہ پیغمبر اسلام مذاق لوگوں سے کیوں کرتے تھے، نبوت تو بڑی چیز ہے۔ عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“ خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں، میں نے ملکہ سے کہا، کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب کی وجہ سے لوگ کھل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دل کی باتیں نہیں

کہہ سکتے تھے: "ملکہ اس جواب کو سن کر مطمئن ہو گئی۔ دیکھا آپ نے! مولانا کی نظر کہاں پہنچی۔ بیداری میں نہیں، خواب میں بھی دماغ وہیں پہنچا تھا، جہاں اس کو پہنچنا چاہیے۔"

(۲) عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا ہے۔ اس کے حساب سے آپ ہی بتائیے کہ اس سوال کا جواب یعنی ایک ڈاڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کر دوں یا نہ کر دوں؟ ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا کہ ڈاڑھی والے جو طے نہیں، تو دال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے وہاں خرابی یہ ہے کہ ڈاڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں۔ مولانا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں کہ اس کا وہ کیا جواب دیں گے مگر سنئے مولانا نے کیا جواب دیا:

"میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پوری دینداری ڈاڑھی والوں میں بھی نہیں پس ایک ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے، تو نری ڈاڑھی لیکر کیا کریں گے؟" (کمالات اشرفیہ ص ۲۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بڑے نکتہ کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے۔ لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے گویا گناہ نگار ہونے نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہیں۔ ان ہی گناہوں میں ایک ڈاڑھی بھی ہے۔ ایک شخص غیبت کرتا ہے بد نظر ہے اور عملی طور پر بے احتیاط ہے لیکن لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ایک بے چارہ ان

عیوب سے بڑی ہے صرف ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے تو سمجھا جاتا ہے
 ڈاڑھی والے صاحب سے ڈاڑھی منڈانے والے کو کیا نسبت، حالانکہ جیسے
 ڈاڑھی منڈانا گناہ ہے۔ ڈاڑھی والوں کے گناہ اس سے کم نہیں؟ پھر ایک
 ڈاڑھی پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ مولانا نے صحیح فرمایا ہے کہ ڈاڑھی منڈانے
 کے سوا اور باتیں لڑکے میں اچھی ہوں تو اس کو گوارا کر لیا جائے بلکہ اس
 برتاؤ سے اغلب ہے کہ ڈاڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آ جائے گا، ورنہ جو
 طریقہ لوگوں نے ڈاڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ منڈا
 والوں کی جڑاتوں کو اس طریقے نے اور بڑھا دیا ہے۔

(۳) مولانا چونکہ خود مولوی تھے۔ اس لئے مولویوں کا خیال ہو گا کہ انگریز
 تعلیم یافتوں پر ضرور مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے۔ اور اس میں شک نہیں
 کہ عربی خواں مولویوں کا مولانا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے۔ مگر ایک
 دفعہ آپ نے فرمایا کہ انگریزی دانوں میں اور ختنی باتیں بھی ہوں، لیکن:
 ”ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے۔ کیوں کہ یہ سمجھ میں آنے سے مان
 لیتے ہیں۔“ (کمالات اشرفیہ ص ۳۳۹)

مولویوں کے اس طریقے کو کہ جو بات منہ سے نکل گئی، اس کی پچ کئے
 چلے جاتے ہیں۔ سخت ناپسند فرماتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا فقرہ
 ”اڈیل ٹو“ اس قسم کے مولویوں کے متعلق نقل فرمایا اور کہا کہ ”جمود و
 اصرار بری چیز ہے، پھر حکمت کی بات یہ فرمائی کہ ”غلطی پر اصرار آدمی کو
 لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے۔“ لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں۔

جوانی غلطیاں مان لیتا ہے۔“

(۴) انگریزی خواں بیچارے بھی تو بہر حال مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ غیر مذاہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا۔ اس قصہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے جب آپ اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ راستے میں کسی اسکول کے سامنے سے گزر ہوا، جہاں زیادہ تر ہندو اساتذہ تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے گزرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلبہ بھی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ:

”میں وہاں رکا اور ان سب سے ملا۔ لوگوں سے میں نے مصافحہ کیے۔“

پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ:

”ایک ایک سے ملا۔ حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پرسی کی۔“

(کمالات اشرفیہ ص ۳۷)

آپ کو معلوم ہے کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے کہ ایسے مدرسہ کے سامنے سے جب گزرتے ہیں اور جیسے حضرت کے ساتھ مدرسہ والوں نے برتاؤ کیا تھا۔ اسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں پھر حضرت نے اس تنگ دل ملا کا ذکر کیا جس کے وعظ میں ایک غیر مذہب کا آدمی جو شاید ہندو ہی تھا، شریک ہو گیا تھا۔ مجلس وعظ میں ہندو کو دیکھ کر ملا صاحب آپ سے باہر ہو گئے گر جنے لگے کہ:

”نکالو اس کا فرمودہ کو“ (کمالات اشرفیہ ص ۳۷)

(۵) بعض خاص نوعیت کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے کہ دیوبندی کی طرف منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے۔ حتیٰ کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ دیوبندی مولوی اس کا یہ جواب دے گا۔ مثلاً یہ سوال کہ ”یا رسول اللہ“ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج جو پایا جاتا ہے۔ دیوبندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا۔ مگر سنئے دیوبندی کے پیشوا کا کیا خیال تھا۔ فرمایا کہ: ”شوقاً والتذاذاً ما ذون فہدہ (کمالات اشرفیہ ص ۳۷) یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے قلوب کا جو اشتیاقی تعلق ہے۔ اس تعلق کا اظہار یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کوئی کرنا ہو ”یا رسول اللہ“ کہنے میں اس کو لذت ملتی ہو، تو مولانا اسی صورت میں یا رسول اللہ کہنے کی اجازت دیتے تھے۔ البتہ استعافۃً واستغاثۃً فرمایا کہ جائز ہو گا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو نمایاں کیا جائے۔ غلط فہمیوں کے ازالہ کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت سے غلط خیالات کی اس سلسلہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اصلاح ہو سکتی ہے۔ میرے پاس اس وقت مولانا کی کتابوں کا ذخیرہ نہیں صرف کمالات اشرفیہ سے سرسری طور پر چند چیزوں کا ارتجالاً انتخاب کر لیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے۔ غایت اخفاء کی وجہ سے پوشیدہ رہے۔ کچھ شک نہیں کہ

اس زمانہ میں بھی بعض مصلحین نے اپنی قوموں سے چھوٹ چھات، نسلی تفریق اور اخلاقی خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے بڑی کوششیں اور اس راہ عمل میں بڑے مجاہدے کئے ہیں مگر اکثر ان لوگوں کے کاموں میں نمود و نمائش کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ان کی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے بھی گہری بات وہ ہے جس کی طرف امام غزالیؒ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ نمائش صرن اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑی ریاکاری یہ ہے کہ پھٹے پرانے گودڑے پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کر لیا جائے کہ جب تک وہ نہ ملے، کپڑے ہی نہیں پہنیں گے۔ اسی طرح یہ ضد کہ میں رہوں گا تو فلاں کے پاس اور پٹھروں کا تو فلاں جگہ۔ مجھے اس میں بھی بجائے بڑائی کے۔ کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے، جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے۔ جس نے التزام کر لیا یہ کہ کھاؤں گا تو جوہی کی روٹی کھاؤں گا۔ تو رسمہ اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جوہی کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے خیر! دوسروں سے مجھے کیا بحث!! میں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ خود ہی فرماتے تھے کہ میرے بھائی اکبر علیؒ نے مجھ سے ایک دن کہا کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے۔ اس لئے چاہئے کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں تو کیا کرو۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے اس مشورہ کو سنکر میں نے عرض کیا کہ:

”کیا کروں، میری طبیعت کے خلاف ہے، میں ریل میں

گنواروں اور بھنگی چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔“

(کمالات اشرفیہ صفحہ ۳۷)

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دنیا میں کتنا چرچا ہے لیکن مولانا نے خود اپنا قصہ جو بیان کیا ہے کہ ”بھاو لپور گیا ہوا تھا، گرمی سخت تھی، جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لئے بلایا گیا۔“

مولانا فرماتے ہیں کہ پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہوئی اور چاہا کہ ان کو واپس کر دوں لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لئے اس ذریعہ سے تو رہائی مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر واپس کر دینے کے خیال کو تو دل سے نکال دیا۔ انتظار کرتا رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے۔ تو میں نے ان قیدیوں سے کہا کہ :

”پنکھا بند کر دو، پھر جی چاہے سو رہو۔ یا بیٹھے رہو کیونکہ

بیگا رہنا جائز نہیں ہے۔“

فرمایا کہ کھانا آیا، تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوا دیا۔ پھر تو ہر قیدی اسی کی

خواہش کرتا تھا کہ میں بلایا جاؤں :

تصوف اور صوفیہ میں

سلاسلِ اربعہ تربیتِ باطن کے متعدد طریقے اور سلسلے رائج ہیں لیکن ان میں سے چار کو زیادہ شہرت و عمومیت حاصل ہے نقشبندیہ جو خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے چلا ہے چشتیہ جس کے بانی خواجہ محمد علی ہمدانی ہیں قادریہ جس کی ابتداء شیخ عبدالقادر جیلانی سے ہوتی ہے اور سہروردیہ جس کی پہلی کڑی شیخ شہاب الدین سہروردی ہیں۔ ان سلسلوں کا طرزِ اصلاح ایک دوسرے سے مختلف ہے بالکل اسی طرح جس طرح اطبائے یونانی، وید، ایلوپیتھیس اور ہومیو پیتھیس اپنے اپنے طریقہ علاج میں ایک دوسرے سے متفرق ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سب کا مقصود ازالہ مرض اور صحت کی بحالی ہے۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بدنی علاج کی بنیاد تو محض عقل و تجربہ پر ہے اس لئے اس میں اختلاف لازمی ہے لیکن روحانی علاج جس کے لئے قرآن حکیم نازل ہوا، اس کے طریقوں میں اختلاف کیوں ہو؟۔ جواب یہ ہے کہ جس نوع کی روحانی صحت پیدا کرنی ہے اور جس ظاہر کے ساتھ اس کا بقا منظور ہے وہ تو منصوص ہے لیکن اس میں جس درجہ کا کمال چاہا گیا ہے اور ہر عبادت میں خلوص و لہیت کے علاوہ قناعت، صبر و شکر، توکل اور رضا بر قضا وغیرہ کا جو مطالبہ کیا گیا ہے اس کے ذرائع متعین نہیں کیا

بلکہ ان میں اجتہاد کو دخل ہے اور مجتہد فیہ مسائل میں اختلاف ناگزیر ہے۔ اور یہ کوئی عیب نہیں۔ چنانچہ حکیم الامت نے بارہا فرمایا:

”میں دو فنون میں ہر زمانہ میں اجتہاد کا قائل ہوں ایک طب جسمانی دوسرے طب روحانی“

غرض صوفیاء کے مختلف سلسلوں کی حقیقت تو بس اتنی ہی ہے۔ مگر بعض کم فہموں نے اس اختلاف کو غلط سمجھا اور ایک دوسرے کی نکیر شروع کی جو انجام کار کے اعتبار سے ہلک ہے کیونکہ ہر سلسلہ میں اللہ کے بیشمار محبوب و مقبول بندے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کرنا (بر بنائے حدیث) اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لینا ہے جس میں کوئی جیت نہیں سکتا حکیم الامت نے اس خطرہ کے پیش نظر ”تعلیم الدین“ کے باب عقائد و تصدیقات میں تحریر فرمادیا ہے:

”جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کر کے دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں اور پیروی مجتہد اور شیخ کی اسی وقت تک جائز ہے جب تک ان کی بات خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ ہو اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو اس میں پیروی نہیں“

پھر اسی کتاب کے باب ”وصایا میں شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے

حوالہ سے نقل فرماتے ہیں :

”مذاہب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے کہ حنفیوں کا
مذہب سب سے اچھا ہے یا شافعیہ کا سب سے بڑا ہے
اپنے مذہب پر عمل کرتا رہے اور نہ صوفیوں کے طریق میں
سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے کہ چشتیہ کی صحبت بڑے
زور کی ہے، دوسرا کہے وہ نقشبندیوں میں اتباع سنت
زیادہ ہے۔ اور اسی قسم کے خرافات سے بچے۔“

عام صوفیائے کرام خصوصاً حضرات چشت

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے وصایا کے حوالہ سے جو بات اوپر نقل
کی گئی اس میں تو ان لوگوں کا ذکر تھا جو آپس میں خواہ مخواہ ایک کو گھٹاتے
دوسرے کو بڑھاتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا گمراہ ہے جو صرف ”کریم کتابی“ ہے
اور ”صحبت“ کے فوائد، روحانی لطائف اور الفاظ کے حقائق و معانی سے
بے بہرہ ہے، عام صوفیا پر لعن طعن کرتا اور خصوصاً حضرات چشت کو راہ
سنت سے بیگانہ قرار دیتا ہے حکیم الامت نے ”السنتہ الجلیہ فی الچشتیہ^{علیہ}
نام سے کچھ کم دوسو صفحات کی کتاب تصنیف فرمائی ہے جس میں ان تمام
بدگمانیوں کا ازالہ کیا ہے اور ان فتنہ پردازوں کا پردہ چاک کیا ہے جو
نفس پرستوں نے حضرات چشتیہ کی نسبت سماع کے انعقاد، علوم قرآن و
حدیث سے بے التفاتی یا کم التفاتی کی جھوٹی روایتیں منسوب کر کے

حائل کر دیا تھا، تمہید میں ایک اصولی بات بتائی ہے۔

”مدت سے عام لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بسا ہوا ہے اور جوں
جوں جہل کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اس میں قوت ہوتی جاتی ہے کہ حضرات
صوفیہ میں عموماً اوجہ پشتمیہ میں خصوصاً شریعت کا اتباع نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے
اس سے دو مفسدے پیدا ہوتے ہیں ایک ان حضرات کے معتقدین میں دوسرا
غیر معتقدین میں“

”معتقدین کے اعتقاد میں خود شریعت ہی کا اتباع اس خیال سے
ضروری نہیں رہا کہ ضروری ہوتا تو خود یہ حضرات ہی متبع ہوتے اور غیر
معتقدین میں یہ مفسدہ ہوتا ہے کہ ان کے اعتقاد میں شریعت واجب الاتباع
ہے مگر چونکہ یہ حضرات ان کے زعم میں متبع نہیں اس لئے وہ ان کی شان میں
گستاخی کرنے لگے اول مفسدہ تو سرحد کفر سے ملا ہوا ہے کہ اس میں جمود
(انکار شریعت مقدسہ کا جس کا جواب نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور دوسرا
مفسدہ گو کفر نہیں، مگر درجہ بدعت شیعہ و معصیت قطعیہ تک یقیناً پہنچتا
ہے کہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل مقبولان الہی سے بدگمانی اور ان کی شان میں
بدزبانی ہے جو نصوص کے خلاف ہے اور نصوص کے خلاف عمل اگر شبہ سے
تو بدعت ہے ورنہ فسق و معصیت بلا شبہ ہے“

ظاہر ہے کہ صوفیائے کرام کی شان میں ساری بے ادبی و گستاخی کا
مدار یہ خیال خام ہے کہ یہ حضرات اتباع سنت میں پورے نہیں ہوتے خصوصاً
حضرات چشتیہ سے متعلق تو بعض غیر محقق اور زام نہاد صوفی بھی کہہ دیتے

ہیں کہ سلسلہ نقشبندیہ میں تو اتباع سنت غالب ہے۔ لیکن چشتیہ میں اس کا اہتمام نہیں۔ اب اس کی تحقیق ایک چشتی اور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حکیم الامت کی زبانی سنئے : فرماتے ہیں :

”حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے متبع سنت ہونے پر قریب قریب سب کو اتفاق ہے اور صحیح اتفاق ہے مگر خود ان کے طریق میں بعض ایسی چیزیں جو نصوص میں وارد نہیں ”شرط طریق“ ہیں اور شرط بھی اعظم واہم ! چنانچہ تصور شیخ باوجودیکہ صریحاً کسی نص میں وارد نہیں اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہو گیا ہے اور اسی خطرہ و غلو کے سبب مولانا شہید ^{رحمۃ اللہ علیہ} سمعیل شہید، اس کو منع فرماتے ہیں چنانچہ انوار العارفین ^{رحمۃ اللہ علیہ} ذکر تصور شیخ میں کنز الہدایہ بحوالہ مکتوبات حضرت مجدد صاحب کا ارشاد نقل ہے :

”ذکر تنہا و بے رابطہ و بے فتائی شیخ موصول نیست، ذکر ہر چند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط بر رابطہ محبت و فتاد شیخ است، آری این رابطہ تنہا بار عایت آداب صحبت و توجہ و التفات شیخ بے التزام ذکر موصول است“ اور گوچشتیہ میں بھی مثل دیگر طریق کے ایسے اشغال ہیں جو صریحاً ^{سنت} میں وارد نہیں مگر کوئی شغل شرط طریق نہیں بلکہ مطلق شغل بھی شرط نہیں بعض کے لئے صرف ذکر ہی کافی ہو جاتا ہے پس چشتیہ کی شان بالکل حنفیہ کے مشابہ ہے کہ باوجود تمام مذاہب سے زیادہ شدیداً اتباع ہونے کے

جیسا کہ ان کے اصول سے ظاہر ہے اپنے دقیق ماتخذ کے سبب مخالفت حدیث میں بدنام ہیں اسی طرح چشتیہ کے اصول سے ان کا سنت میں شدید الاتباع ہونا ظاہر ہے جیسے کے اوپر ایک اصل دلیل گزری کہ ان کے طریق میں کوئی امر ایسا شرط مقصود نہیں جو سنت میں وارد نہ ہو اور اصول ہی اصل معیار ہیں۔“

اس اصولی گفتگو کے بعد باب اول میں ان حضرات کے بعض وہ اقوال درج ہیں جن میں اتباع سنت کی تاکید فرمائی گئی ہے باب ثانی میں بعض وہ افعال نقل کئے گئے ہیں جن سے خود کا شدید الاتباع ہونا ثابت ہوتا ہے اور باب ثالث میں بعض ایسے اقوال یا افعال کی توجیہ فرمائی گئی ہے اور ان کے اشکال رفع کے گئے ہیں جن سے بادی النظر میں عدم اتباع سنت کا وہم ہوتا ہے۔ اب بھی اگر کوئی صوفیائے کرام اور خصوصاً حضرات چشتیہ سے متعلق بدگمانی رکھے تو اسے اختیار ہے لیکن پھر وہ اپنی عاقبت کی خیر منائے!

دینا لا یجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا دینا انک دوف رحیم

گر وہ صوفیہ میں حضرت شیخ اکبر کی نسبت آپ کا مسلک

المعروف بہ شیخ اکبر کی ذات ایسی ہے جس کے مؤید اور غیر مؤید دونوں تائید

سے اس سلسلہ میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد دوم مولفہ مولانا سید مناظر حسن

گیلا فی رحمتہ علیہ بصیرت افروز ہے (مولف)

یا عدم تائید کے وقت جادو اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں حکیم الامت کی میانہ روی ملاحظہ ہو:

تیسرا مسلک حضرت شیخ قدس سرہ کے باب میں یہ ہے کہ بنا بر شہادت جم غفیر اکابر امت جس کی حجت الہیہ شہدائے ارض سے ثابت ہے شیخ کی مقبولیت و ولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں اور شیخ کے اکثر علوم جو ان قبیل اسرار میں اود میرے ہم سے خارج ہوں عقلاً نہ ان کے اثبات کا حکم رکھتا ہوں یا تنہا لا تقف مانعین لك به علم اور نہ ان کی نفی کا باہتمام آیت بل کذبو بما لم يحيطوا به اور بلا ضرورت شرعیہ ان کی اشاعت و اشتغال کو مضر سمجھتا ہوں بحکم آیت اما الذین فی قلوبہم رزغ فیتبعون ما تشاء منہ ابتغاء الفتنة وابتغاء تأويله اور طبعا ان کے قول کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں اطمینان نہیں پاتا ہوں اس لئے مطابق حدیث دع ما یوریک الی ما یوریک ان کا استحضار نہیں کرتا اور جن علماء نے حفاظت شریعت کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اقوال شیخ بلکہ شیخ پر نکیر کیا ہے ان کو حسب آیت لا یكلف اللہ نفساً الا

وسعها اور حدیث انما الاعمال بالنیات پر محمول کرتا ہوں و اور اس مجموعی

مسلک میں اپنے کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ متوافق دیکھتا ہوں جیسا کہ ان کے بعض مکتوبات سے

ظاہر ہے البتہ مجدد صاحب میں یہ امر مزید ہے کہ وہ ان کے اقوال پر کلام بھی کرتے ہیں جو بوجہ ان کے محقق و صاحب کشف ہونے کے ان کا حق ہے اور ہم یہ منصب نہیں رکھتے، بقول
عارفِ روحیؒ

آرزو منخواہ لیک اندازہ خواہ

برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

امام ابن تیمیہؒ باب توازن طبع کے ختم پر حضرتؒ کی ایک تحریرِ بڑی تل کی جا چکی جس میں امام ابن تیمیہؒ سے بعض مسائل میں شدت اختلاف کے باوجود ان کے رد میں سخت الفاظ کے استعمال سے اپنی برائت ظاہر کی گئی ہے، ذیل میں مسئلہ توسل سے متعلق حکیم الامت کی توضیح اور ابن تیمیہؒ کی شدت کی توجیہ نقل کی جاتی ہے، جس سے صاحب سوانح کا اعتدال مسلک نمایاں ہو گا۔ فرمایا:

”ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ توسل اعمالِ صالحہ سے تو مطلق جائز ہے اور

عیان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ زندہ ہوں تو بایں معنی جائز ہے

کہ ان سے دعا کی درخواست کی جاتی ہے اور اموات سے تا جائز

کیونکہ وہاں یہ معنی متحقق نہیں اور اس پر احادیث سے استدلال

کیا ہے، چنانچہ توسل بالاعمال کے جواز پر بخاری کی اس حدیث سے استدلال

کیا ہے کہ تین آدمی ایک غار میں بند ہو گئے تھے اور تینوں میں

سے ہر ایک نے اپنے ایک ایک عمل سے توسل کیا یعنی اس کا واسطہ

دے کر نجات کی دعا کی اور وہ دعا قبول ہو گئی۔ پھر توسل

بالاعیان کے متعلق حضرت عمرؓ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے
استسقاء میں حضرت عباسؓ سے تو توسل کیا جس کے وہی معنی
ہیں کہ ان سے دعا کی درخواست کی اور حضور صلی اللہ علیہ
وسلم سے توسل نہیں کیا، اگر غیر احیاء سے توسل جائز ہوتا تو
حضرت عمرؓ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے توسل کو اختیار
فرماتے! —

”توسل بالاعمال“ کو نواب تیمیہ بھی جائز کہتے ہیں، اس لئے اگر میں
ان کے زمانہ میں ہوتا یا وہ میرے زمانہ میں ہوتے تو میں نہایت
ادب سے عرض کرتا کہ حضرت اس توسل بالاعمال کی حقیقت
ہے کیا؟ میری سمجھ میں تو اس کی یہ حقیقت آئی ہے کہ جب کوئی
شخص یہ کہتا ہے کہ اے اللہ فلاں عمل کے طفیل و صدقہ میں
یہ کام کروے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اے اللہ یہ عمل
آپ کے نزدیک محبوب ہے اور آپ کا وعدہ ہے کہ آپ کے
عمل محبوب سے جس کو تلبس ہو اس پر خاص رحمت ہوتی ہو
اور اس عمل کے ساتھ ہم کو بھی کسب و صدور کا تلبس ہے
لہذا اس تلبس پر جو وعدہ رحمت کا ہے ہم آپ سے اس
رحمت کو طلب کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر
اگر کوئی ”توسل بالاعیان“ بھی کرے تو توسل بالاعیان اور
توسل بالاعمال میں کیا فرق ہے؟ پھر خواہ وہ اعیان احیاء ہوں

یا اموات کیونکہ اب اس توسل بالاعیان کا واسطہ یہ ہو گا کہ
 اے اللہ یہ بزرگ زندہ یا مردہ آپ کے محبوب ہیں اور آپ کا
 وعدہ ہے کہ آپ کے محبوب سے جس کو تلبس ہو اس پر رحمت
 ہوتی ہے اور ہم کو ان بزرگ کے ساتھ عقیدت و محبت کا
 تلبس ہے اس لئے ہم آپ کی اس رحمت موعودہ کے طلبگار
 ہیں۔ اب فرمائیے کہ اس میں احیاء اور اموات کا کیا فرق رہ گیا؟
 مجھ کو یقین ہے کہ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد
 ابن تیمیہ اگر زندہ ہوتے تو علی الاطلاق توسل بالاعیان الموتی
 کی ممانعت سے رجوع فرما لیتے! — مگر اب بھی میں ان کے
 قول کی یہ توجیہ کرتا ہوں کہ توسل ممنوع سے مراد ان کی
 وہ توسل ہے جو فریاد و استغاثہ تک پہنچا ہوا ہو، اور مطلقاً
 توسل بالموتی کی ممانعت نہیں کرتے ہیں۔ یا یہ توجیہ کی جائے
 کہ توسل ممنوع تو وہی توسل ہے جو فریاد و استغاثہ کی شکل
 میں ہو مگر انہوں نے سداً للباب مطلقاً ممانعت کر دی تا کہ
 عوام جائز توسل سے ناجائز میں نہ پھنس جائیں، کیونکہ توسل
 صرف مباح اور جائز ہی ہے، مقاصد و واجبات سے تو نہیں
 اور جس جائز امر سے فتنہ و گمراہی پھیلنے کا اندیشہ ہو اگر اہل علم
 اس سے رول دیں تو کچھ مضائقہ نہیں!

زمرہ عشاق میں شاید سب سے زیادہ

حسین ابن منصور حلاج بدنام شخصیت منصور حلاج کی ہے

جو اصل میں حسین ابن منصور ہیں ان سے متعلق حکیم الامت نے ایک تحقیقی رسالہ "القول المنصور فی ابن منصور" کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس کی ابتداء میں ایک اصولی بات لکھی ہے:

"کسی غیر مقبول کے ساتھ حسن ظن رکھنا مضر نہیں اور مقبول سے بلاوجہ بدگمانی کرنا مضر ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی رذیل کے ساتھ شریفوں جیسا معاملہ کرنا برا نہیں لیکن کسی شریف کے ساتھ رذیلوں جیسا برتاؤ بہت برا ہے۔ پھر خاتمہ پر ارشاد ہے:

"ایسی سخت سزا اور سنگین مصیبت کو اس درجہ صبر و استقلال کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے تحمل کرنا نہ کسی زاہد خشک سے ممکن ہے نہ کسی ساحر زندقہ سے اور عین اس حالت میں نشہ توحید سے سرشار ہو کر محبت و عشق الہی کا ایسا درد انگیز اظہار کرنا مشائخ وقت بھی نعرہ حسب الواحد افراد الواحد سن کر رقت پذیر ہو گئے اور اس درد انگیز حالت میں شبلی جیسے امام طریقت کے ساتھ سوالات کا جواب دینا ابن منصور کی جس شان یکتا کو ظاہر کرتا ہے زمانہ کی نگاہ نے اس کا نظارہ بہت کم کیا ہو گا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ابن منصور

کا واقعہ قتل اور مہمان خور ہوش رہا ہی ان کے سچے صوفی، عاشق
خانی محبوب سبحانی، اور صاحب استقلال لاثانی ہونے کی
بڑی دلیل ہے۔ ہا یہ امر کہ اس مجمع میں کسی نے بھی ان کی اس
حالت استقامت اور مستی محبت و رجہ کمال سے ان کی ولایت
و معرفت پر کیوں نہ استدلال کیا؟ تو اہل بصیرت نے ضرور
کیا ہو گا۔

اب حکم الامت کی ایک جامع
ایک عام اصول و راہم انتباہ نصیحت درج کی جاتی ہے جس سے
ان کے عام اعتدالی مسلک کی پوری پوری وضاحت ہوگی اور ہر ایک کو اپنے
مسلک کی درستی کا موقع ملے گا ابشاد ہوتا ہے:

”جن حضرات میں قبول کے علامات ظاہر ہیں اور منجملہ ان
علامات کے علمائے محققین کا حسن ظن بھی ہے ان کے ساتھ
حسن اعتقاد رکھے، اور ان کے کلام میں اگر کوئی امر ظاہراً
خلاف سواد اعظم دیکھے تو اپنا اعتقاد اس کے موافق نہ رکھے۔
نہ اس کو کسی کے سامنے تل کرے، نہ ایسی کتابوں کا خود

لے منصور علاج کی شہادت سے متعلق مولانا روم کا خیال ہے کہ یہ وزیر حامد کی
کی سازش و عداوت کا نتیجہ تھی۔ فرماتے ہیں:

چوں قلم در دست غدارے فتاد
لاجرم منصور بردارے فتاد (غرم)

مطالعہ کرے جب تک کسی شیخ سے نہ پڑھ لے کیونکہ ان حضرات کا مقصود عوام کے لئے تدوین نہیں بلکہ عوام سے اخفا فرمانا تھا لہذا اعتقاد سواد اعظم کے موافق رکھے اور اس کلام میں اگر تاویل ممکن ہو تو تاویل کرے ورنہ غلبہ حال پر جمبول کرے یا دشمنوں کے ملحق کر دینے کا احتمال کرے یا مثل متشابہات کے اس کو مفوض بہ حق کرے کیونکہ گو وہ معصوم نہ تھے لیکن شریعت کے بے حد منتج تھے چنانچہ غیر معذور سے اگر کوئی فعل خلا شریعت ظاہر ہو تو اس پر ان سے خود نکیر منقول ہے اور اس لئے احکام میں خود ان سے ایسا امر منقول نہیں جو شریعت کے خلاف ہو صرف بعض "اسرار" منقول ہیں جن کی بنیاد ذوق و کشف پر ہے اور تعبیر خاص اصطلاح میں کی گئی ہے اور ان دونوں چیزوں سے چونکہ عوام اور اہل ظاہر بے بہرہ ہیں اس لئے ان کے کلام کے معارض شریعت ہونے کا یہ لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے، گو ظاہری (علم و فضل کے اعتبار سے) ان سے بڑھے ہوئے ہوں اس لئے ان کو اجمالاً تسلیم کر لینا چاہیے ورنہ گستاخی سے سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے !!

البتہ جو شخص ایسا ہی محقق ہو اس کو حق ہے کہ ایسے کلام

پر مفصلاً رد کرے، خواہ ”خطائے اجتہادی“ کے درجہ میں

اور خواہ ”ابطال“ کی حد تک!“

صوفیانہ مجاہدات میں چار چیزیں مشہور و عام ہیں
مجاہدات اربعہ اور اہم سمجھی جاتی ہیں۔ قلت طعام۔ قلت منام
 قلت کلام۔ قلت اختلاط مع الاثام، یہ مجاہدات حضرت امام غزالیؒ سے
 لے کر اس صدی تک اس طرح متواتر چلے آ رہے ہیں کہ بعض غیر فن داں
 لوگوں نے ان کو قطعی حیثیت دیدی ہے حالانکہ یہ اور اس قسم کے سارے
 مجاہدات اجتہادی اور بہ اعتبار زمانہ لائق تبدیلی ہیں۔ ہر صاحب عقل
 سوچ سکتا ہے کہ آج کل جبکہ لوگوں کے قویٰ اس قدر ضعیف ہو چکے ہیں
 اور مختلف افکار نے ان کے ذہنوں کو گھیر لیا ہے۔ قلت طعام اور قلت
 منام کے مجاہدات ان کے لئے کس طرح مناسب و کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اسی
 بدلی ہوئی صورت حال کے پیش نظر اشرافی مسلک سے یہ دونوں چیزیں
 خارج کر دی گئیں ہیں، البتہ کم گوئی اور لوگوں سے کم آمیزی کے حسب حال
 برقرار رکھا گیا کیونکہ جو مضرتیں زبان و اجتماع کے ذریعہ اس دور میں پیدا
 ہیں وہ شائد ہی کبھی رہی ہوں گی۔ مگر یہ بات اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے
 جبکہ زہد کی حقیقت اور مجاہدات کی بنا سمجھ میں آئے خود حکیم الامت کی
 زبانی اس کو سمجھئے۔ فرماتے ہیں :

”زہد ترک لذات کا نام نہیں محض تقلیل لذات کافی

ہے یعنی لذات میں اہٹاک نہ ہو کہ رات دن اسی فکر میں

رہے یہ چیز زہد کے منافی ہے ورنہ اگر بلا تکلف اور بلا
 اہتمام خاص کے لذات میسر آئیں تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے،
 شکریہ کرنا چاہیے۔

”بہت کم کھانا بھی زہد نہیں، نہ یہ مقصود ہے کیونکہ
 ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدائے تعالیٰ کے خزانہ میں
 کوئی توقیر تھوڑا ہی ہو جائے گی، ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ
 پیٹ میں درد ہو جائے، ہمارے حاجی داد اللہ صلی
 کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے لیکن اس سے
 کام بھی خوب لے، میرا تو خیال ہے کہ ”مزدور خوش دل
 کند کار بیش“ حضرت حاجی صاحب نے ایک روز فرمایا
 کہ میاں اشرف علی پانی ہمیشہ ٹھنڈا پیو کہ ہر بن موسیٰ
 الحمد للہ نکلتے، ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی
 دل شریک نہ ہوگا۔

اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے۔ نہ اتنا
 زیادہ سوئے کہ کسل ہو نہ بہت کمی کرے کہ پوست خشکی
 ہو جائے۔

البتہ کثرت کلام پر تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔
 ”زیادہ گوئی قابل ترک ہے حضرت عارفین کا مشاہدہ
 ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہی تو اس سے قلب پر

ظلمت کا اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک کنجڑ اداں بھڑلے لو
 امر و ڈکچا دتا پھرے تو ذرا برابر قلب میں اس سے غفلت
 نہ آئے گی کیونکہ بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک
 جملہ بھی زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہو جاتا ہے۔
 اسی طرح لوگوں سے تعلق بڑھانے کو سخت مضر بتایا ہے فرماتے ہیں:-
 ”اگر تم ارتباط بالاحباب کی وجہ سے معمولات کو ناغہ
 کرو گے تو ایک دن بالکل کورے رہ جاؤ گے، من کا
 دودلہ کا دلی دلی۔“

سیاسی مسلک میں

دینی مسائل ہوں یا دنیوی ایک مصلح امت جب ان کو پرکھے گا تو اس کی کسوٹی صرف کتاب و سنت ہی ہو سکتی ہے چنانچہ ”ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے گوشہ میں ایک دور بین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا، اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا اس نے پوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جبکہ تحریک خلافت نے نہ صرف عام مسلمانوں کو بلکہ بڑے بڑے علماء کو کانگریسی مسلک سے متفق کر دیا تھا اس مرد آخر میں کی نظر اس ہنگامہ آرائی کے ہولناک مناظر کو دیکھ رہی تھی اور چونکہ طے ”اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی“ اس لئے عین اس طوفانی دور میں آپ نے اپنی بالادعوت کی فکر کئے بغیر جو کچھ حق سمجھا اس کو بڑا

پیش کر دیا گیا اسکے صلے میں الزامات ملے، کسی نے انگریز کا پٹھو کہا کسی نے کہا کہ یہ تو مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس کے باوجود آپ کو اپنے مسلک میں مستحکم پایا تو آزادی کا نعرہ بلند کرنے والوں نے اشرا کی جماعت تھانہ بھون میں بھیجا تاکہ اس زبان ہی کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے جس سے ان کے خلاف مرضی باتیں نکل رہی تھیں، یہ ٹکڑی آئی اور لاکھٹیوں سے مسلح راستہ کے کنارے چھپ بیٹھی تاکہ صبح جب حکیم الامت مسجد جا رہے ہوں تو ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ حضرت تھانوی کو اسکی اطلاع ملی، آپ مراقب ہوئے، میلان قلبی بھی رہا کہ مسجد جایا جائے، حسب معمول ایک ہاتھ میں لالٹین اور ایک ہاتھ میں لاکھی لٹے ہوئے صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے چل پڑے جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپ پھپھے تھے تو ان پر اس درجہ ہمت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشہ وہاں سے بھاگ پڑے اور پہلی ٹرین کے ذریعہ تھانہ بھون سے چلے گئے اور پھر کسی نے ایسی جرأت نہ کی۔

ہیبت حق است این از خلق نیست

ہیبت این مرد صاحب دل نیست

یہ سب کچھ ہوا لیکن جو اعتدال اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو آپ بہ حیثیت مجتہد اپنی رائے میں بہت مستحکم تھے مگر چونکہ یہ مسئلہ بالکل اجتہادی تھا اس لئے خود اپنے حلقہ ارادت کے علماء کو بھی اختلاف رائے کی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی، البتہ جب بعض علماء نے حدود سے تجاوز کیا اور خود حضرت کو اپنی قائم

کردہ رائے کے سامنے غلط ٹھہرانے کی کوشش کی اور اعتدال سے
 ہٹ گئے، تو حکیم الامت نے بھی ان کو اپنے زمرہ سے نکال دیا۔ بعد کو جب
 خلافت تحریک کی آندھی ختم ہوئی اور حکیم الامت کے محسوس کردہ خدشات
 حقائق بن کر سامنے آئے تو ان حضرات کی ندامت و خجالت بیان سے
 باہر رہی لیکن پھر نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔

اب اس اصولی اعلان متعلقہ جز پیش کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندو
 مسلم اتحاد اور ترک موالات سے متعلق ۱۳۳۹ء میں شائع فرمایا تھا۔

تحریک خلافت
 تحریکات حاضرہ کا خلاصہ اس وقت دو امر ہیں
 (۱) تعاون جس کی نفی کا نام ترک موالات رکھا ہے اور
 دوسرا اتحاد ہندو مسلم :

امراول (یعنی ترک موالات) کا درجہ اول وہ نوکریاں یا وہ لین دین
 کی صورتیں ہیں جو دلائل شرعیہ سے فی نفسہ ناجائز ہیں اور ان کے ناجائز
 ہونے پر ہمیشہ علماء فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں۔ اور وہی فتویٰ اب بھی
 باقی ہے۔ مثلاً جن نوکریوں میں سود کی ڈگری دی جائے یا جس تجارت
 میں سود کا معاملہ ہو۔ اسی طرح وہ دوستانہ معاشرت جو خاص مسلمانوں
 ہی کا حق ہے یا وہ علوم و فنون حاصل کرنا جو دین میں مضر ہیں سوان میں
 واقعات حاضرہ کو کچھ دخل نہیں اور نہ ان میں مسلم اور غیر مسلم میں کچھ
 تفاوت ہے ان سے اختلاف حال میں احتجاج کرنا اور حقیقت غلط بحث
 اور بالکل بے ربط و بے محل بات ہے۔

امر ثانی (ہندو مسلم اتحاد) کا درجہ اول وہ اتحاد ہے جس کا حاصل
 عدم نزاع ہے یعنی دونوں فریق حد و حد کے اندر رہ کر اپنے اپنے فرائض
 منصبی کو ادا کریں اور ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں اور حقوق ہمساگی کی با رعایت کھیں،
 سو یہ درجہ فی نفسہ جائز ہے اور اب بھی اسکے چوانہ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔
 امر اول (ترک موالات) کا دوسرا درجہ مباح: اجارات و
 تجارت و تعلیمات و استعانات و تعلقات حاکمیت و محکومیت کے ہیں۔
 "امر ثانی (ہندو مسلم اتحاد) کا دوسرا درجہ وہ اتحاد ہے جس کی
 غرض ہندوستان کے لئے آزاد حکومت کا حاصل کرنا ہے اس وقت
 علماء و عقلاء کا انہیں دو درجوں میں اختلاف ہے پس بعض تعاون کے
 اس درجہ کو جائز اور اتحاد کے اس درجہ کو ناجائز کہتے ہیں یہ تحقیق ہے
 محل اختلاف کی، اب اس اختلاف کی حقیقت دنیا سمجھے، یہ تعاون یا
 اتحاد شرعاً فی نفسہ نہ واجب ہے نہ حرام ہے۔ شرعاً امور مباحہ سے
 ہے، چنانچہ اہل علم پر ظاہر ہے، یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں آگے بعض کی نظر اس عدم
 تعاون مع حکومت اور اتحاد مع الہندو کے مصالح و منافع ضروری تحصیل فی زعمہم یعنی
 وہ مصلحتیں جو ان کے زعم میں ضروری تھیں) پر پڑی اور وہ "خلافت کٹھنی" والے ہیں۔ ان
 عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو واجب و جائز کہا۔ اور بعض کی نظر اس عدم
 تعاون اور اتحاد کے مفار و مفاسد دینیہ حالیہ و مالیہ ضروری الاجتساب یعنی موجود
 و آئندہ قابل ترک برائیوں) پر پڑی جن کی تفصیل خاص خاص تحریرات میں شائع بھی
 ہو چکی ہے۔ ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو ممنوع کہا، اور احقر کی
 بھی یہی رائے ہے اور کسی بنا پر یہی اول میں اس کو فتنہ کہا تھا، یہ حقیقت اور بنا ہے

اس اختلاف کی، اب اس سے امور ذیل معلوم ہو گئے ہوں گے۔

(ایہ کہ اس اختلاف کی دونوں شقیں قطعی نہیں ہیں۔ طنی اجتہادی ہیں۔ پس ان میں اختلاف کی گنجائش ہے، گو کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم بھی کسی طرے عالم کے ساتھ اختلاف کرے محض اختلاف سے کسی فرقی کو دوسرے فرقی پر لعن طعن یا سب و شتم یا لعنت و ملامت یا تضلیل و تہلیل یا فسق و کفر یا جبر و تشدد و ظلم و ایذا یا بقول یا بالعمل کسی بزرگ کا اس کا مخالف بنے ادب مشہور کر کے بدنام کرنا جائز نہیں (بحکم مقدمہ ۱) البتہ منکرات شرعیہ پر انکار یا تبصیح واجب ہے اور اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں بعض واقعات و عوارض کا اختلاف ہے جس کی شرعی مثالیں مقدمہ ۲) میں مذکور ہو چکی ہیں اور ایک عرفی مثال اور معروض ہے اختلاف دلائل کی مثال دو یونانی متحد الاصول طبیبوں کا اختلاف اس مریض کے باب میں ہے جو کمزور بھی ہے اور اس میں کسی مادہ قاسدہ کا بھی غلبہ ہے۔ ایک طبیب نے اسپر نظر کی کہ صبتاک مادہ کا تنقیہ نہ کیا جائے گا قوت نہ آوے گی اس لئے سہل تجویز کر دیا، دوسرے طبیب نے اس پر نظر کی کہ جب تک قوت کی بقاں تدبیر نہ کی جاوے گی سہل ہی کا متحمل نہ ہوگا اس لئے سہل کو منع کیا اب یہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ مادہ کا تنقیہ بھی ضروری ہے اور قوت کا تحفظ بھی ضروری ہے مگر پھر بھی عوارض کے سبب دونوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا، پس اختلاف ان دونوں مسئلوں کا اسی قبیل سے ہے کہ منافع و مضار پر نظر پڑنا اس کا باعث ہو گیا۔

”تیسرا امر یہ معلوم ہو کہ اس عدم تعاون کا نام جو بعض نے ترک موالا
 رکھ لیا ہے اس عنوان سے اس کا حکم جو اوپر مذکور ہوا بدل نہ جائے گا
 (بحکم مقدمہ ۳) جیسا کہ بعض نے یہ ترکیب رکھی ہے کہ قرآن مجید میں جو موالا
 کی ممانعت کی آیتیں آئی ہیں۔ اس عدم تعاون کو اس میں داخل کر کے اختلاف
 کرنے والے فریق کو قرآن کا مخالف بتا کر عوام الناس کو اس سے متوحش و
 متنفر کرتے ہیں جس طرح دہلی میں مولد نے اپنی مجلس متعارفہ کا نام مجلس ذکر
 رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قیام کا نام تعظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 رکھ کر اہل حق کی طرف سے عوام کو بدگمان کر دیا کہ ذکر و تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم
 سے منع کرتے ہیں۔ یا امتناع و امکان کے مسئلہ میں اس طرح بدنام کیا کہ یہ لوگ
 یوں کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے پس ایسے ہی اصطلاح ترک
 موالا سے کام لیا جا رہا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کوئی نام رکھ دینے سے حقیقت
 نہ بدل جائے گی اس لئے حکم بھی نہ بدلے گا۔ باقی ایسی ترکیب سے کام لینا
 اہل ایم کے شان کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنے نزدیک ان مسائل اور
 اس اختلاف اور اپنے مسلک کی حقیقت بالکل صاف کر دی ہے اگر اس پر
 بھی بدنام کرنے کا شوق ہو تو اس سے زیادہ نہ کہوں گا کہ فصیح و جمل
 واللہ المستعان علی ما تصفون۔

والسلام

احقر اشرف علی۔ تھانہ بھون جمادی الاول ۱۳۳۹ھ

لیگ و کانگریس اس لا جواب اعلان کے بعد حکیم الامتؒ پر اوجھے دار
 کئے گئے۔ لیکن قدرت نے ان سب کی مدافعت کی
 اور دنیا نے دیکھ لیا کہ آپ کی کہی ہوئی بات پتھر کی لکیر نکلی اور خلافت تحریک
 کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حرماں نصیبی اور پریشانی اور بعض صورتوں میں
 بے دینی کا منہ تک دیکھنا پڑا۔ لیکن اب تو کانگریسی مسلمان عوام اور علماء کا
 غیض و غضب اور بھی بڑھ گیا اور حکیم الامتؒ کو ابتداءً انگریزوں کا کاغذ
 اور پھر مسلم لیگ کا کٹر حامی سمجھا جانے لگا۔ اور آج بھی بعض نہ جاننے والے
 حکیم الامتؒ کے سیاسی مسلک کی نزاکت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آپ کو
 ”لیگ“ کا ایسا ہی حامی سمجھتے ہیں جیسا کہ اس کے باضابطہ اراکین تھے، ذیل میں
 آپ کا ایک اور جامع بیان درج ہے جس سے آپ کے مسلک کی پوری پوری طرح
 وضاحت ہوتی ہے اور حمایت لیگ کے حدود کی تعیین ہو جاتی ہے یہ ایک
 صاحب کے استفسار کا جواب ہے جس کو ”تنظیم المسلمین“ کے نام سے موسوم
 فرمایا ہے۔

”قال اللہ تعالیٰ“ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا الایۃ

بعد الحمد والصلوة احقر اشرف علی مدعا نگار ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ
 آج کل ہندوستان میں مفادِ ملکی کے نام سے ایسی سیاسی جماعتیں جو
 تنظیم و تعمیر کی جامع ہوں دو ہیں۔ ایک کانگریس، دوسری مسلم لیگ،
 اور دونوں اپنی اپنی طرف شرکت کی دعوت دیتی ہیں اور نافعیت میں ایک
 دوسرے پر ترجیح دیتی ہیں اہل رائے اختلاف رکھتے ہیں اور اسی کی تحقیق

کے لئے مدت سے مترددین کی طرف سے شرکت کے متعلق مختلف عنوانات سے سوالات کا سلسلہ جاری ہے اب تک چونکہ دونوں کے واقعات کا کافی علم نہ تھا اس لئے جواب کی بنا زیادہ تر سائلین کے بیان پر ہوتی تھی اور احیاناً جواب کے کچھ حصہ میں ثقات کی روایات کو بھی کچھ دخل ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات بغرض مزید تحقیق خود سائل سے بھی واقعات کی تنقیح کی جاتی تھی، اور ان بناؤں کے اختلافات سے مختتم جواب نہ ہو سکتا تھا جس سے ممکن ہے کہ سائل کو شفا ئے تام نہ ہوتی ہو اور اس صورت میں یقیناً ایسے جوابوں سے طریق عمل کا اخذ کرنا جو سوال سے اصل مقصود تھا دشواری سے خالی نہ تھا، اس لئے سخت ضرورت تھی کہ واقعات کی مزید تعین و تحقیق کی جائے جس کے لئے مختلف ذرائع اختیار کرنا ممکن ہو گیا۔ اور آج آپ کا خط اس جواب کے پیش کرنے کا محرک ہو گیا۔

یہ چند سطریں اسی جواب کی حکایت
حمایت لیگ کے حدود
 ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ فضائے حاضر میں مسلمان کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے تمام منافع اور مصالح کی حفاظت اور تمام مضار و مفاسد سے صیانت اسی تنظیم پر موقوف ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم و عمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شرعیہ

کے موافق ہو (جو آیت پیشانی میں) اعتصام بحبل اللہ کی لا تقربوا پر تقدیم سے بھی ظاہر ہے) سو اگر اس وقت ملک میں اس صفت کی کوئی جماعت موجود ہوتی یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت افسوس کہ ایسی جماعت کا نہ تحقیق ہے نہ قریب میں توقع، اس لئے بجز اس کے چارہ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں۔ اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسرے کی دشوار ہو تو یہ قاعدہ عقلیہ و نقلیہ من ابلی بلبتین فلیختار لھونھا (جس کا مافذ کثرت میں سے ایک مافذ حدیث بریرہ میں یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اعتقیھا واشترطی لھما المولا علی ما قررہ النوادی فی شرح الصحیح مسلم) اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ سوائے متعلق جہاں تک تفحص بلوغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا مذکورہ مسئلہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے اور کانگریس کی اصلاح متعسر (زیادہ مشکل) بلکہ متعذر ہے جس کے وجہ کا خلاصہ وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ خالص کلمہ گویوں کی جماعت ہے اور کانگریس میں عنصر غیر مسلمین کا ہے اور جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کو شریعت کے قریب لانا بہ نسبت اس کے جو اسلام کو حق نہیں جانتا ظاہر ہے کہ سہل ہے۔ نیز مسلم لیگ کے اعلانات جیسے لیگ کا مینوفسٹو وغیرہ اور کانگریس کے معاملات

اس کے شاہد ہیں رسالہ "آزادی جنگ کو جس کا آپ نے سوال میں
حوالہ دیا ہے، میں نے بھی دیکھا ہے واقعی اس میں ان معاملات کی
تفصیل اچھی طرح دی گئی ہے۔ منصف مزاج کے لئے اس کا مطالعہ
میرے خیال میں کافی ہے۔ پس اس اصل کی بنا پر شرح صدر کے ساتھ
میرزا یارے قائم ہوئی کہ مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ مسلم لیگ
میں داخل ہونا چاہئے۔ پھر ان میں جو اہل قوت ہوں وہ اہل قوت کو وقتاً
فوقتاً یاد دہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاح مطلوب کی درخواست
کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء و محققین سے مدد لیتے رہیں۔
جو علماء اس میں شریک ہوں ان سے تو علمی و عملی دونوں امداد حاصل کریں
اور جو اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضا بطہ شریک نہ ہوں ان سے
صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات ظاہر کر کے احکام شرعیہ معلوم
کرتے رہیں اور ان کے موافق مسلم لیگ کی حالت کو درست کرتے رہیں اور مسلم لیگ جو معاملات
پیش آئیں ان کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضا بطہ شریک نہ ہوں
ان سے استفتار کیا جائے اور ان میں بھی اگر اختلاف ہو تو شرعاً دونوں شقوں میں گنجائش
سمجھی جائے اور دونوں شقوں میں سے مدبروں کے نزدیک جو مصلحت ہو
اس پر عمل کیا جائے اور جو علماء کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار
نہ رہیں بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں اور وہ خدمت بندگان
خدا کو احکام شرعیہ کی تعلیم و ترغیب دینے کی ہے جو مشترک طریقہ ہے حضرات
انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بلکہ پہلی قسم کے علماء کو بھی جتنا وقت

مسلم لیگ کی خدمت سے بچے اس اشاعت احکام میں حصہ لینا ضروری ہے۔ پس اس تفصیل سے بقاعدہ تقیم عمل (جو آیت وما کان المؤمنون لینفروا کما فترفلوا نفراً من کل فرقۃ منهم طائفتہ لیتفقہوا فی الدین سے لیا ماخوذ ہے) سب کو اپنے کام میں مشغول ہونا چاہیے، پھر اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ وعدہ الہی ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (سورہ ہود) وانا لا نضیع اجر المصلحین (سورہ اعراف) کا ظہور ہوگا اور اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ سہیت مذکورہ اس تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلاً جاری و بایں رکھیں کیونکہ اس کے ثمرہ کی تو ہمیشہ ہی حاجت ہے یہ تو خلاصہ ہے اپنے انتظام کا، باقی دوسروں کے ساتھ معاملہ سوانظما کے بعد اگر کانگریس مسلم لیگ سے صلح کی طرف مائل ہو تو حسب ارشاد وان جنحو المسلم فاجمع غما اس سے اصول شرعیہ کے موافق تنقید و تدبیر کے ساتھ اہل تجربہ و اہل علم و اہل فہم کے مشورہ سے صلح رکھیں مگر اپنی تنظیم مذکورہ اس وقت بھی قوت و استقلال کے ساتھ قائم رکھیں اس کو کمزور نہ کریں، نہ کانگریس میں مدغم کریں۔ کہ یہ شرع اور تجربہ دونوں کے اعتبار سے نہایت مضر ہے۔ اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ صاحب قوت و صاحب اثر تیار ہو جائے اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو اور ان سب حالات میں قولاً و فعلاً و عملاً و تقریراً موافق و مخالف ہر ایک کے ساتھ اخلاق اسلامی کو اپنا شعار رکھیں، جب ارشاد ہے وقل لعباد

یقولوا للیٰ حق و غیرہا من الآیات، خلاصہ دستور العمل یہ ہے کہ
 از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت نہ آمیزش کی ضرورت، رغنائے حق کو
 مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام
 میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے، یہی عبودیت
 کی روح ہے اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے اور اس استقلال و استقامت
 کے ساتھ ہی دعا و انتہال کو اصل و وظیفہ و تدبیر سمجھیں اور پھر نصرت حق کے
 منتظر رہیں، اب اس تحریر کو بند گوں کی ایک نافع وصیت اور دو جامع
 دعاؤں پر ختم کرتا ہوں، یہ دعائیں بھی ورد رکھنے کے قابل ہیں خصوصاً بعد
 نماز۔

وصیت

کار کن کار بگذرا ز گفتار کاندریں راہ کار باید کار

دعائے اول۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا لِحَقِّ حَقًّا وَاَدْنٰ قَنَاتًا تَبَاعَدُ اِوَارِنَا الْبَاطِلَ بِالْاِطْلَاقِ
 وَدَرْقِنَا اجْتِنَابًا

دعائے ثانی اَللّٰهُمَّ اِنصُرْ مِنْ نَصْرِ دِيْنِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَجْعَلْنَا
 مِنْهُمْ وَاَحْدِلْ مِنْ حَزَلِ دِيْنِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ
 نوٹ: اس جواب میں میں نے اپنے مزید اطمینان کے واسطے اختیاطاً اپنی
 جماعت کے متعدد محقق علماء سے بھی مشورہ کر لیا ہے ان سب نے بھی اس سے اپنی
 موافقت کا اظہار فرمایا۔

۲: یہ جواب مسلم لیگ کی موجودہ حالت پر ہے اگر خدا نخواستہ حالات

بدل جائیں تو حکم بھی بدل جائے گا۔

۳۔ جو صاحب اس مضمون کو شائع کرنا چاہیں وہ اس کا خلاصہ شائع نہ کریں بلکہ بجنسہ پورا مضمون شائع کریں، خلاصہ کرنے میں بہت سی فریگزاشتیں اور نیز غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں اور اگر کسی کو کسی کے شائع کردہ مضمون میں کچھ کمی بیشی کا شبہ ہو تو تمھانہ بھون کے ماہوار رسالہ "النور" بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ سے مقابلہ کر لیں کہ اس رسالہ میں میرا یہ مضمون بعینہ پورا چھپا ہے۔

والسلام خیر ختا ص :

مقام تمھانہ بھون - ۹، ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء

لیگ و کانگریس کی مثال

تفصیلی بیان آپ کے پیش نظر آچکا، اب حضرت کا ایک ملفوظ سنئے چند جملوں میں لیگ و کانگریس کا موازنہ فرمایا ہے اور حمایت مسلم لیگ کی وجہ بتائی ہے یہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کا ارشاد ہے:

”میں نے جو اعلان شائع کیا ہے اس میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مگر صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابل اصلاح بلکہ واجب اصلاح ہیں۔

ہاں مسلم لیگ نسبتاً کانگریس سے اچھی اور بہت اچھی ہے لہذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شریک ہونا

چاہئے۔ میں کانگریس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں اور

مسلم لیگ کو کانالے کے مشابہ اور ظاہر ہے کہ اندھے کو

کانے پر ترجیح ہوگی۔ مثلاً اگر کسی کو نوکر رکھنے کی ضرورت
 ہو اور اتفاقاً دو نوکر ملیں ایک اندھا، ایک کانا، اب فرمائیے
 وہ کس کو نوکر رکھے گا، اندھے کو یا کانے کو؟ یقیناً کانے ہی کو
 رکھے گا، بس اسی بنا پر میں مسلم لیگ کا حامی ہوں۔“

(ملفوظات: اسعد الابرار)

مومن کا نفرش حکیم الامت کی بصیرت و تدبیر کا ایک ادباہم واقعہ
 نقل کر کے اس عنوان کو ختم کیا جائے گا۔ ستمبر
 ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے، کانپور میں ”مومن کا نفرش“ ہو رہی تھی اور ان لوگوں اور
 دوسرے مسلمانوں میں زیادہ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی یہاں تک کہ مومن صاحبان
 میں سے ایک شخص قتل بھی ہوا تھا، غرض اس خلفشار کی حالت میں انہی دنوں
 حکیم الامت کا بھی کانپور آنا ہوا، لوگوں کی درخواست پر حضرت نے ایک
 مصاحبتی بیان شائع کیا جس سے فضا صاف ہو گئی، اس بیان کو غور سے
 پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ کس قدر بے لاگ اور ساتھ ہی مصالحانہ بھی ہے:

”الاختلاف للاعتراف“

”بعد الحمد والصلوة“

مجھ سے مختلف مسلمان اقوام کے متعلق جن میں بعض قومیں دوسری قوموں
 کی تنقیص و تحقیر کرتی ہیں اور بعض قومیں میں اپنے کو بلا دلیل دوسری قوموں میں
 داخل کرتی ہیں، پوچھا گیا کہ یہ دونوں فعل شرعی قاعدے سے کیسے ہیں؟

اس کا جواب عرض کرتا ہوں کہ یہ دونوں فعل شرعاً فیج ہیں، پہلا تفریط ہے اور دوسرا افراط، تفصیل اس کی یہ ہے کہ نصوص شرعیہ اس باب میں ظاہراً دو قسم کے ہیں، ایک مثبت مساوات و تماثل، ایک مثبت تفاوت و تفاضل، چنانچہ حدیث جاننے والوں کو معلوم ہے اور ظاہر ہے کہ نصوص میں تعارض نہیں ہو سکتا، لہذا دونوں کے لئے جدا جدا محمل قرار دیا جائے گا پس نصوص مساوات تو احکام متعلقہ آخرت کے باب میں ہیں، یعنی آخرت کی نجات کے لئے ایمان و اعمال صالحہ کے مدار ہونے میں سب برابر ہیں، اسی طرح اسلامی حقوق میں اور دینی کمال حاصل کرنے کے بعد تقدم میں سب برابر ہیں مثلاً سلام و تسمیت عا طس و عبادت و شہود و جنازہ میں کہ حقوق اسلامیہ ہیں، یا تحصیل اوصاف استحقاق امامت کے بعد، یا تحصیل علوم دینیہ کے بعد، یا تحصیل کمالات باطنیہ کے بعد، امام یا استاد یا شیخ بنانے کے استحقاق میں سب برابر ہیں، چنانچہ مدعیان شرافت عرفیہ بھی سب قوموں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، ان سے علوم حاصل کرتے ہیں، ان سے بیعت ہوتے ہیں، ان کو بطور خلافت طریق بیعت و تلقین کی اجازت دیتے ہیں، چنانچہ خود احقر ایسے حضرات کا شاگرد بھی ہے اور بعض میری طرف سے مجاز طریقیت بھی ہیں، پس نصوص مساوات کا تو یہ محمل ہے اور نصوص تفاوت احکام واجہ الی المصالح الدنیویہ کے باب میں ہیں جیسے شرف نسب یا نکاح میں کفاعت، حتیٰ کہ جو اقوام عرفاً اعلیٰ طبقہ کی مشہور ہیں خود ان میں بھی باہم گراں تفاوت کا شرعاً اعتبار کیا گیا ہے، قریش میں بنی ہاشم کا شرف نسب بقیہ قریش پر نص میں وارد ہے۔ کفاعت میں قریش کا شرف

غیر قریش پر گو و دہی عربی ہوں دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، اب نصوص میں کوئی
تعارض نہیں پس اس تفاضل کے یہ معنی نہیں کہ کوئی قوم اپنے کو بڑا سمجھ کر دوسرے کو
حقیر سمجھے بلکہ صرف بعض احکام میں جن کا بیان اوپر گذر چکا اس تفاضل پر
عمل کی اجازت ہے، پس جو لوگ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو اعتقاداً یا عملاً
حقیر سمجھتے ہیں یا بلا دلیل شرعی بڑی قوموں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں،
یہ دونوں، افراط و تفریط میں مبتلا ہیں پہلی جماعت کا تکبر تو کھلا ہوا ہے کہ
دوسروں کو علانیہ حقیر سمجھا، مگر دوسری جماعت والے بھی عند التامل تکبر کا
اتکاب کر رہے ہیں کیونکہ جب ایک قوم سے نکل کر بلا دلیل شرعی دوسری قوم
میں داخل ہونے کی کوشش کی تو حین قوم سے نکلنا چاہا ہے اس کو حقیر سمجھا
ورنہ اس سے نکلنے کی کوشش کیوں کرتے اور علاوہ تکبر کے نسب کے بدلنے کے
گناہ کا بھی اتکاب کرتے ہیں جس پر حدیث میں سخت وعید وارد ہے۔ بہر حال
ان احکام کے علم کے بعد دونوں جماعتوں پر واجب ہے کہ افراط و تفریط
سے توبہ کر کے اتباعِ نصوص کے تحت میں حدود شرعیہ کے اندر رہیں اور
باہم ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں اور کمالات دینیہ حاصل کریں
کہ اصلی شرف یہی ہے نہ نہ دوسرے اسباب شرف آخرت میں نافع نہ ہونگے
جو کہ مسلمان کا اصل مقصود ہے۔ واللہ الموفق۔ اور یہ سب مضمون آیت
”یا ایھا الناس اذ خلقناکم من ذکر و انثیٰ مالی قولہ تعالیٰ، ان اکرمکم عند اللہ
اتقاکم“ میں مذکور ہے، احکام آخرت میں مساوات تو صراحۃً فی قولہ ”ان اکرمکم
عند اللہ اتقاکم“ پس تقویٰ کے مدارک پر میت ہونے میں سب مساوی ہیں اور احکام

دنیویہ میں تفاوت قریب بہ صراحت فی قولہ تعالیٰ ”وجعلناکم شعوب و قبائل
 لتعارفوا“ تقریر دلالت یہ ہے کہ اختلاف شعوب و قبائل کی غایت تعارف و تمانز
 کو فرمایا اور ظاہر ہے کہ تعارف و تمانز احکام دنیویہ میں سے ہے اور خود مقصود
 بالذات نہیں بلکہ ادائے حقوق خاصہ کے لئے ہے اور جو حقوق تعارف و تمانز
 پر متفرع ہوتے ہیں وہ سب احکام متعلقہ بالمصالح الدنیویہ ہیں، پس اس طرح پر
 دلالت حاصل ہو گئی۔ واللہ الحمد علی ما علم و فہم و ہدانا الی الطریق الاقوام فقط
 ۱۶ رجب ۱۳۵۶ھ

کتبہ بقلمہ اشرف علی عفی عنہ فی کانپور الخدمین نقاد مومن کاقرنس
 ۱۶ رجب ۱۳۵۶ھ

(اذا رمان جاودان)

وصیتیں

کسی کوچ کرنے والے کے آخری کلمات گویا اس کی تجرباتی زندگی کا حاصل اور اس کے جذبات و احساسات قلبی کی صحیح ترین تصویر اور اس کی خیر اندیشی کا اعلیٰ ترین مرقع ہوتے ہیں اس لئے اس شخص کے مسلک کی بہترین ترجمانی انہی وصیتوں سے ہو سکتی ہے پس ہم حکیم الامت قدس سرہ کی وصیتوں کے وہ اجزاء جن کا تعلق عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح سے ہے ذیل میں درج کرتے ہیں جن سے اس مردِ دل و دلہ، شیخ شفیق عارف کامل حکیم الامت، اور مجددِ وقت کا مسلک بلکہ سارے مسلک کی روح اور اس کا مدار واضح ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

(۱) میں اپنے دوستوں سے اس قدر عا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ و کبیرہ، عمد و معطل کے لئے استغفار فرمائیں اور جو میرے اندر عادات و اخلاق ذمہ ہیں ان کے ازالہ کی دعا کریں۔

(۲) میرے بعض اخلاق سیئہ کے سبب بعض بندگانِ خدا کو حاضرانہ و غائبانہ میری زبان و ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچیں ہیں اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے اس قدر عا کرتا ہوں کہ اللہ دل سے ان کو معاف فرمادے اور اللہ تعالیٰ ان کی تقصیرات سے درگزر فرمادیں گے میں بھی ان کے لئے دعا

کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دالین میں عفو و عافیت عطا فرما دیں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگزر کا بڑی فضیلت آئی ہے اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو حسب فتویٰ شرعی مجھ سے عوض لے لیں، خدا کے لئے قیامت پر مواخذہ نہ رکھیں کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

(۳) اس قبیل کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہو گئی ہوں بطیب خاطر گذشتہ اور آئندہ کے لئے محض خدائے تعالیٰ کے راضی کرنے کو اور اپنے خطاؤں کے معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔

(۴) چونکہ محبت میں اکثر مدارج غیر واقعہ مشہور کر دیئے جاتے ہیں اس لئے میں اپنی سوانح لکھا جانا پسند نہیں کرتا اگر کسی کو بہت ہی بیتابی کا شوق ہو اور دوسرے اہل تدبیر و تحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاط شدید کو واجب سمجھنا چاہیے ورنہ میں بری ہوتا ہوں۔

۱۵ تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے اختصار موہم یا زیادات موہم یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں اس کی اطلاع جزوی طور پر دیتا ہوں اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں ان کے لئے دو قاعدے عرض کرتا ہوں ایک یہ کہ میری کسی تصنیف میں جو اس محل لغزش سے متاخر ہو اس کی اصلاح کر دی گئی ہو۔ اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے معلوم

ہو سکتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو اس میں آخر کا قول میرا سمجھا جائے دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مواقع مشتبہ کو دوسرے علمائے محققین سے تحقیق کر لیا جائے اور ان کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جائے۔ اسی طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گزرے اس میں بھی یہی تقریر معروض ہے کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کر دیا ہے لیکن پتہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں یا اس سائل کے پاس میری تصحیح کے محفوظ نہ رہنے کی تقدیر پر احتمال غلطی میں پڑنے کا ہو سکتا ہے۔ اس لئے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا۔

(۶) میری تحریرات میں جو مضامین از قبیل، علوم مکاشفہ ہیں جو کہ علم تصوف کی ایک قسم ہے جس کو حقائق و معارف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور صحیح شرعیہ ان سے ساکت ہیں ان کو حسب قاعدہ اصولیہ و کلامیہ امور ثابتہ بدلائل شرعیہ کے درجہ میں نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ بالکل اعتقاد نہ رکھنا بھی جائز ہے اور اگر اعتقاد رکھے تو محض احتمال کے درجہ سے تجاوز نہ کرے۔

(۷) میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فقہ دینیہ سے حفاظت ہو سکے جس کی آج کل سجد کثرت ہے اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

۸۔ دینی یا دنیوی مضر توں پر نظر کر کے ان امور سے خصوصیت کے ساتھ

احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ (۱) شہوت و غضب کے مقتضایہ عمل نہ کریں (ب) تعجیل نہایت بُری چیز ہے (ج) بے مشورہ کوئی کام نہ کریں (د) غیبت قطعاً چھوڑ دیں (س) کثرت کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہوا و کثرت اختلاط خلق بلا ضرورت شدیدہ و بلا مصلحت مطلوبہ اور خصوصاً جب کہ دوستی کے درجہ تک پہنچ جائے پھر خصوصاً جب کہ ہر کس و ناکس کو راز دار بھی بنالیا جائے نہایت مضر چیز ہے اٹا بد و ناپوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھایا جائے (ز) بد و ناسخت تقاضے کے ہمبستر نہ ہوں۔ (س) بڑن سخت حاجت کے قرض نہ لیں (ص) فضول خرچی کے پاس نہ جائیں (ط) غیر ضروری سامان جمع نہ کریں (ع) سخت مزاجی اور تند خوئی کی عادت نہ کریں اور ضبط و تحمل کو اپنا شعار بنائیں (ف) ریا و تکلف سے بہت بچیں، اقوال و افعال میں بھی طعام و لباس میں بھی (ق) مقتداء کو چاہیے کہ امر اسے نہ بد خلقی کرے اور نہ زیادہ اختلاط کرے اور نہ ان کو حتی الامکان مقصود بناوے بالخصوص دنیوی نفع حاصل کرنے کے لئے (ک) معاملات کی صفائی کو دیانات سے بھی زیادہ ہتہم بالشان سمجھیں (گ) روایات و حکایات میں بے انتہا احتیاط کریں اس میں بڑے بڑے دیندار اور فہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں خواہ سمجھنے میں خواہ نقل میں دل، بلا ضرورت بالکلیہ اور ضرورت میں بلا اجازت تجویز طبیب حاذق و شفیق کے کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں (م) زبان کی غایت درجہ ہر قسم کی معصیت و لاعبتی سے احتیاط رکھیں (ن) حق پرست رہیں اپنے قول پر جمود نہ کریں اور تعلقات

نہ بڑھائیں (کسی کے دنیوی معاملات میں دخل نہ دیں۔

حتی الامکان دنیا و مافیہا سے جی نہ لگائیں اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اسی وقت پیام اجل آجائے تو فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو لولا آخرتئی الی اجل قریب فاصداق و اکین من الصالحین۔
 اور ہر وقت یہ سمجھیں عمر "شاید ہمیں نفس نفس واپس ہو دے" اور علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے اور رات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہیں اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

میں اپنے متنبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی عمر بھر یاد کرے کہ سورۃ یسین شریف یا تین بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر حجہ کو بخش دیا کرے مگر اور کوئی امر خلاف سنت، بدعت عوام و خواص میں سے نہ کرے۔
 میرے ایصال ثواب کے لئے کبھی جمع نہ ہوں نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔
 اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہو جائیں تو تلاوت وغیرہ کے وقت قصداً متفرق ہو جائیں۔ اور ہر شخص متفرداً بطور خوجین کا دل چاہے دعا و صدقہ و عبادت نافذ سے نفع پہنچا دے نیز میری مستعمل چیزوں کے ساتھ تعارف طریق سے تبرکات کا سامعہ نہ کریں البتہ اگر کوئی محبت سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے مضائقہ نہیں اس کا اعلان اور دوسروں کے دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

خاتمہ بالخیر ہونے کو تمام نعمتوں سے افضل و اکمل اعتماد رکھیں اور

ہمیشہ خصوصاً پانچوں نماز کے وقت نہایت لجاجت و تضرع سے اس کی دعا
 کیا کریں اور ایمان حاصل پر شکر کیا کریں کہ حسب وعدہ لسن شکر تم لازید نکم
 یہ بھی اعظم اسباب ختم بالخیر سے ہے اور اسی کے ساتھ میں اپنے بھی اس دعا کیلئے
 درخواست کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی ایمان پر
 خاتمہ فرمائے۔

باری تعالیٰ اس راقم، سچپان کو اور احقر عبدالمنان کو اور ہر مسلمان کو
 حسن خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین ثم آمین

مست

باب پنجم

معالجات اشرفیه

معالجات اشرفیہ

حصول احسان و تقویٰ کا فن جس کو اصطلاح عام میں تصوف کہتے ہیں ایک نہایت دقیق فن ہے اس میں حکیم الامتؒ کو جو نظر عمیق حاصل تھی اسکا اندازہ زیر نظر تالیف کے عنوان "شان تربیت" سے عیاں ہے آپ کے معالجات زائد از ہزار صفحات میں تربیت السالک کے نام سے جمع و محفوظ کئے گئے مگر یہ ذخیرہ غیر منظم شکل میں تھا آپ کے ایک خلیفہ ارشد مولانا محمد عیسیٰ صاحب نے جو ظاہر و باطن میں شیخ قدس۔۔۔ کی تصویر تھے، اس منتشر مواد کو مرتب و مدون کیا اور اس کو فن سلوک کی ایک بنیادی و نصابی کتاب کی حیثیت میں لے آئے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس تالیف کو پسند فرمایا اور اس کا نام مولف کے نام کی مناسبت سے "انفاس عیسیٰ" تجویز فرمایا۔

بقول حضرت سیدی مدظلہ انفاس عیسیٰ کیلئے ایک "قرا بادین تصوف" ہے اس لقب سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح "قرا بادین اعظم" کے چھپ کر شائع ہو جانے یا ڈاکٹر کنیت کی رپورٹری "قرا بادین" کے دستیاب

۱۔ حکیم محمد اعظم خاں صاحب کی مشہور و مقبول قرا بادین
۲۔ ایک مشہور ہومیوپیتھک ڈاکٹر۔

ہونے کے باوجود اب بھی مریضوں کو اطباء اور ڈاکٹروں کی احتیاج بدستور لاحق ہے اور ان کی تشخیص و تجویز کے بغیر امراض سے نجات مجال ہے اسی طرح گویہ قرآباد تصوف "محررات سے پر ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھی کسی ماہر طبیب روحانی کی رہبری کی ضرورت ہے چنانچہ جس طبیب حاذق و شیخ کامل کے یہ محیرات جمع کئے گئے ہیں خود اس کا یہ ارشاد ہے:

"نردگوں سے جو بعض اختیاری مجاہدات منقول ہیں وہ بطور قرب العبد کے نہیں بلکہ محض بطور معالج کے ہیں جس کی تجویز کے لئے مجتہد کا اجتہاد یا شیخ کی اجانت ضروری ہے"

ایک اور مقام پر اس سے زیادہ صاف اور واضح ارشاد ہے۔
 "اگر کوئی شخص شیخ سے مستغنی ہو جائے تو اس وقت وہ چھوٹا ہونا شروع ہو جائے گا" ایک دوسری جگہ مشائخ سے تعلق کی ایک اور افادیت بھی بتائی ہے جو نرمی کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی فرماتے ہیں:

"مشائخ اعمال صالح کی وجہ سے بابرکت ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعلیم میں بھی برکت ہوتی ہے جس کی وجہ سے جلد شفا ہو جاتی ہے خود کتابیں دیکھ کر علاج کرنا کافی نہیں۔"

اس ضروری تمہید کے بعد اب اسی "قرآبادین تصوف" سے آجکل کے

لے بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مریض کسی طبیب سے مستغنی ہو کر خود ہی اپنا علاج آپ شروع کر دے تو غلط سلاط ورائیں کھا کر اپنی صحت و قوت میں خرابی اور کمی پیدا کرتا چلا جائے گا۔

بعض عام اور ہلکے امراض کا صرف ایک ایک نسخہ درج کیا جاتا ہے جس سے صاحب سوانح علیہ الرحمۃ کی حذاقت اور عہارت فن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

”اختیاری امور میں کوتاہی کا علاج

اختیار کا نسخہ اور ہر مرض

بجز ہمت اور استعمال اختیار کے کچھ

روحانی میں اس کی ضرورت نہیں اسی پر مدار ہے تمام اصلاحات

کا اور یہی ہے اصل علاج تمام کوتاہیوں کا۔ سارے افعال شرعیہ

اختیاری ہیں ورنہ نصوص کی تکذیب لازم آتی ہے پس جب اختیار کا

استعمال کرے گا تو کامیابی لازم ہے البتہ دشواری اور کلفت اول اول

ضرور ہوگی لیکن اس کا علاج بھی یہی ہے کہ باوجود کلفت کے ہمت

اور اختیار سے برابر بہ تکلف اور بہ جبر کام لیتا رہے رفتہ رفتہ

وہ کلفت تبدیل بہ سہولت ہو جائے گی۔“

”عذاب آخرت کا مراقبہ تمام پریشانیوں

پریشانیوں کا علاج

سے نجات دینے والا ہے اس سے

کلفت و کمزورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی فکر سے قلب میں نورانیت و انشراح

ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ

اور تعلق ہو جاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے

والا ہے۔“

”بدنگاہی میں ایک درجہ میلان کا ہے جو کہ

بد نظری کا علاج

غیر اختیاری ہے اس پر مواخذہ بھی نہیں

اور ایک درجہ ہے اس کے مقتضاء پر عمل کرنے کا یہ اختیار ہی ہے اس پر
 مواخذہ بھی ہے اور اس عمل میں قصداً دیکھنا اور سوچنا سب داخل ہے
 اس کا علاج کف نفس (نفس کو روکنا) اور غصہ بصر (نگاہ کو نیچے رکھنا) ہے
 کہ یہ بھی اختیار ہی ہے کہ ہمت کر کے اس کو اختیار کرے گو نفس کو تکلیف ہو
 مگر یہ تکلیف نارحہم کی تکلیف سے کم ہے (یعنی نارحہم کی تکلیف کا تصور جائے
 موافق) اور جب چند ذہمت سے ایسا کیا جائے گا تو میلان میں بھی کمی
 ہو جائے گی بس یہی علاج ہے اس کے سوا کچھ علاج نہیں اگرچہ ساری عمر
 سرگرداں رہے۔“

”معالجہ اللہ تعالیٰ نے ہر
 مبتلائے شہوت رانی کا علاج مرض کا بنایا ہے استعمال

میں ہمت کی ضرورت ہے اس کے اجزایہ ہیں (۱) پورے چالیس روز خلوت میں
 رہو (۲) سب سے مطلقاً کلام ترک کر دو وہاں حوائج ضروریہ کے متعلق
 جو کلام ہو۔ مثلاً کھانے کے متعلق یا بازار کے سودا سلف کے متعلق اور
 وہ بھی بقدر ضرورت مستثنیٰ ہے (۳) کسی کے پاس نہ بیٹھو نہ ملو بجز مجلس
 شیخ کے (۴) تین روزے متواتر رکھو اور اس میں اوراد سے جو وقت بچے
 استغفار اور نوافل میں مشغول رہو (۵) جملہ اعضاء کے معاصی سے سخت
 پرہیز کرو پھر شیخ کو اطلاع دو۔“

”جب کی غیبت کرے اس کو اپنی حرکت سے اطلاع
 غیبت کا علاج کرو یا کرے تھوڑے دن اس پر مداومت سے

انشاء اللہ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا لیکن جس سے معافی چاہیے اس کو غیبت کی تفصیل بتلانا ایذا دینا ہے اس لئے اجمالاً یوں کہنا کہ ”میرا کہا سنا معاف کرو“ کافی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی کھٹی ان کے سامنے اس کی مدح و ثنا کرے اگر بات چھوٹ نہ ہو بلکہ سچ ہو تو یوں کہہ دے کہ بھائی فلاں بات جس کی بنا پر غیبت ہوئی تھی، پر اعتماد کر کے فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا کیونکہ خود مجھے اس بات پر اعتماد نہیں رہا“ (یہ تو یہ ہو گا کیونکہ سچی بات پر کبھی اعتمادِ قطعی بغیر وحی کے ہو نہیں سکتا) اگر وہ شخص جس کی غیبت کی کھٹی مر گیا تو اس کے لئے دعا اور استغفار کرتا رہے یہاں تک کہ دل میں یہ یقین ہو جائے کہ اب وہ راضی ہو گیا۔

”نعمت پر فخر کرنا کبر ہے اور کبر کی حقیقت اور اس کا علاج اس کو عطا ہے حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا“ شکر ہے اسی طرح کبر و استغنا میں بھی فرق ہے کبر یہ ہے کہ اپنے کو کسی کمال میں دوسرے سے بڑا سمجھنا اور اس کے ساتھ دوسرے کو حقیر سمجھنا اگر یہ نہ ہو کسی کمال کی وجہ سے دوسرے کی حقیر متصور نہ ہو تو استغنا ہے۔

تکبر کا علاج تو یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور علاج یوں سمجھے کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسرے کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص معیوب یقینی

وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے اس لئے مجھے اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا چاہیئے
اور عملی علاج یہ ہے کہ جس کو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو اس کے ساتھ تعظیم و
تکریم سے پیش آؤ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے تجربہ سے یہ ثابت ہوا
ہے کہ جب تک عملی علاج نہ کیا جائے گا تکبر دور نہ ہوگا۔

”جس وقت غصہ آئے امور ذیل کی پابندی کرے
غصہ کا علاج (۱) میں بھی حق تعالیٰ کا خطا وار ہوں اگر وہ بھی اس طرح
غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہو (۲) اگر میں اس کو معاف کر دوں گا اللہ تعالیٰ
مجھ کو معاف فرمادیں گے (۳) ایسے وقت فوراً کسی کام میں لگ جائے خصوصاً
مطالعہ کتب میں۔ (۴) اس جگہ سے ہٹ جائے (۵) اعوذ باللہ کثرت سے
پڑھے (۶) پانی پی لے (۷) وضو کر لے۔“

حسد وہ ہے جس میں محسود سے زوال نعمت
حسد اور غیظ کا فرق کی تمنا ہو اور غیظ (ریشم) وہ ہے کہ اس کے
پاس رہتے ہوئے اپنے لئے بھی حصول کی تمنا ہو۔

حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اس کے لئے ترقی
حسد کا علاج کی خوب دعا کیا کرے اور اس کے ساتھ احسان بھی
کرتا رہے خواہ مال سے یا بدن سے یا دعائے چند دلوں میں حسد دور
ہو جائے گا۔

کینہ اور طبعی انقباض کا فرق اور کینہ کا علاج
کینہ وہ ہے جو اختیار و قصد سے

کسی کی برائی و بدخواہی دل میں رکھی جائے، رنج کی کوئی بات پیش آئے اور اس سے ملنے کو جی نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں کینہ کا علاج یہ ہے کہ جس سے کینہ ہو اس کے ساتھ بہ تکلف اختلاط و احسان کرے!

حب جاہ کا علمی و عملی علاج "اس رذیلہ یعنی (حب جاہ) کی جو مذمتیں اور وعیدیں وارد ہیں

ان کا ذہن میں حاضر کرنا بلکہ زبان سے بھی ان کی تکرار کرنا بلکہ ان مضامین سے اپنے نفس کو زبان سے خطاب کرنا کہ تجھ کو ان سے عذاب پہنچنے کا اندیشہ ہے اسی کے ساتھ اپنے عیبوں کا استحضار اور نفس کو خطاب کہ اگر لوگوں کو ان رذائل کی اطلاع ہو جائے تو کتنا ذلیل اور حقیر سمجھیں تو یہی غنیمت ہے کہ لوگ نفرت و تحقیر نہیں کرتے چہ جائیکہ ان سے تعظیم و مدح کی توقع رکھتا ہے۔ اس کا عملی جزویہ ہے کہ مداح کو زبان سے منع کر دے محض سرسری طور پر نہیں بلکہ اہتمام سے اور ساتھ ہی جو لوگ ذلیل شمار کئے جاتے ہیں ان کی تعظیم کرے گو نفس کو گراں ہو۔

ریا کی حقیقت اور اس کا علاج "ریا کی حقیقت یہ ہے کہ عباد کا اظہار کسی دنیوی غرض سے کیا جاوے یا کسی فعل مباح کا اظہار کسی معصیت کی غرض سے کیا جائے عام صوفیوں کا مشہور قول یہ ہے کہ خلق سے اظہار عبادت ریا اور محققین حضرات کا ارشاد ہے کہ خلق سے اخفائے عبادت بھی ریا ہے کیونکہ مخلوق پر نظر ہی کیوں گئی جو اس سے اخفاء کا اہتمام کیا اگر مخلوق کو

کا لعدم اور لاشے اور ایسا سمجھتے جیسے مسجد کی صفیں تو ان سے اخفا نہ کرتے۔

علاج ریاضائے خلق سے بچنا چاہتے ہو تو فنا کا طریق اختیار کرو بغیر فنا کے مل کے ریاضے حفاظت نہیں ہو سکتی۔

علاج کذب ”جس کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو اس کا عجیب و غریب عملی علاج یہ ہے کہ جس سے کلام کرے اس سے پہلے کہہ دیا کرے کہ میری عادت کثرت سے جھوٹ بولنے کی ہے“ قصور سے دلوں کی مداوت میں انشاء اللہ یہ عادت چھوٹ جائے گی۔

وسوسوں کا علاج ”وسوسہ سے اصلاً پریشان نہ ہو بلکہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب) فرمایا کرتے تھے کہ

ان وساوس کو جمال حق کا مرآۃ (آئینہ) بنالے، اس طرح کہ یوں مراقبہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب قدرت ہے کہ دل میں ایک دریا خیالات کا پیدا کر دیا ہے جس کی کہیں انتہا ہی نہیں اور جو کہیں نہ کہنا ہی نہیں۔ اسی طرح وساوس کو قدرت حق کی معرفت کا وسیلہ بنانے سے انشاء اللہ وہ خود بند ہو جائیں گے، کیونکہ شیطان کا مقصود تو وساوس سے یہ ہے کہ خدا سے بعید کرے۔ جب خود ان وساوس ہی کو قرب کا وسیلہ بنا لیا تو اب شیطان وسوسے ڈالنا بند کر دے گا، غالباً شیخ ابوسلیمان دارانی کا ارشاد ہے کہ وساوس سے خوش ہو کر وہ یعنی خوشی ظاہر کیا کرو کیونکہ شیطان کو علم غیب نہیں ہے جب تم خوشی ظاہر کرو گے تو وہ یہی سمجھے گا کہ دل سے خوش ہو رہا ہے اور وہ مسلمان کو خوش کرنا نہیں چاہتا

اس لئے وسوسہ ڈالنا بند کر دے گا۔

”تم اپنی طرف سے بلا تجویز کرو۔“
حصول راحت کا نسخہ اکسیر نہ راحت بلکہ وہ جو تجویز کر دیں

اس پر راضی رہو حضرت یہ نسخہ اکسیر ہے جس سے نہ اہل دنیا کو استغنا ہے
 نہ اہل دین کو، نہ علماء کو استغنا ہے نہ عرفا کو بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے۔

(۱) اہل اللہ کا مذہب (یعنی طریقہ) رکھو،
اسراف سے بچاؤ کی تدبیریں وضع دار لوگوں کا مت رکھو رسم و

روح کے ذرا بھی مقید نہ بنو (۲) بلا ضرورت ہرگز مقروض مت بنو گو
 رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے (۳) سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو،

جتنی چیزیں کام میں آتی ہوں رہنے دواور جتنی چیزیں کام میں نہ آئیں
 خارج کر دو، یا بیچ دو یا مسکین کو دیدو، نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو

زکات ہی میں دیدو اس گھر کا معائنہ کیا کرو، گھر میں بہت سی چیزیں ایسی
 ہوں گی جو سٹر رہی ہوں گی، کسی کو دیکھ لگ رہی ہوگی، ایسی چیزیں کو

اپنی ملک سے الگ کر دو تاکہ گھر میں رولت ہو (۵) روزہ مرد معاشرت میں
 یہ مقرر کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو، بے تامل مت کرو (۶) کسی

کے کہنے سے کوئی کام مٹ کر دو (یعنی محض مرد تا جب کہ اپنے پاس سکی
 گنجائش نہ ہو) پس اپنی رائے پر (یعنی اپنی مال گنجائش کا اندازہ لگا کر)

عمل کرو!“
 ”محاجہ سے مقصود نفس کو

محاجہ کا مقصد اور اس کی! پریشان کرنا نہیں بلکہ نفس کو

مشقت کا خوگر بنانا اور راحت و تنعم کی عادت سے نکالنا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ معطل ہو جائے گا۔

نفس کو آرام پہنچانے اور سزا دینے کا طریقہ بچوں کے ساتھ

معاملہ کرو کہ بچوں سے جب کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اول اس کو مٹھائی وغیرہ دے کر بہلاتے ہیں، اگر اس سے بھی نہ مانے تو دھمکی سے کام لیتے ہیں، اگر اس سے بھی نہ مانے تو بس دے چیت دے چیت!! اسی طرح تم بھی نفس کے حظوظ (خوشیوں) کو تو پورا نہ کرو باقی حقوق ادا کرتے رہو خوب کھلاؤ پلاؤ، اچھی طرح کام لو کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

ہاں جب کسی طرح باز نہ آئے تو اب سزا دو مگر خود سزا نہ دو بلکہ کسی (شیخ) کے حوالے کر دو، وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔ ورنہ جو لڑکا اپنے ہاتھ اپنے پچیت مارے گا وہ تو آہستہ مارے گا اور محقق سزا کافی دے گا مگر حقوق نہ تلف کرے گا۔

ذکر میں بار محسوس ہونا اور اس کا علاج "بار ایک مشقت ہے مشقت میں اگر جی

پنکے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، جس طرح بھی ہو حتیٰ الوسع پورا کر لیا جائے۔ شدہ شدہ سب دشوار کا

مبدل بہ آسانی ہو جائے گی۔“

”ذکر میں لطف و لذت کا حاصل ہونا ایک نعمت ہے اور نہ ہونا دوسری نعمت ہے جس کا نام مجاہدہ ہے، یہ اول سے النفع زیادہ مفید ہے گویا اَلْذِّیْ زَیَادَہُ لَذِیْنِہٖ نہ ہو،

”ذکر کا اثر موقوف ہے تقلیل کلام، تقلیل اختلاط مع الانام و قلت التفات الی التعلقات (یعنی تعلقات پر توجہ نہ دینا) پر۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے مواعظ کا اور مثنوی کا مطالعہ کرنا چاہیے خواہ سمجھ میں نہ آئے!!“

”افسوس عوام تو کیا دھیان اور دھن ضروری ہے علماء میں بھی نماز روزہ تو ہے مگر دھیان اور دھن اور اللہ تعالیٰ سے تعلق، اُن سے لگنا لپٹنا، ان کی محبت میں گھلنا، یہ نہیں ہے اور بدون اس کے کام نہیں چلتا کیونکہ بدون اس کے نماز روزہ پر استقامت، خطرہ میں رہتی ہے، ہر وقت نفس سے منازعت و جنگ رہتی ہے اور ظاہر ہے کہ منازعت کے ساتھ اول تو کام ہی خود دشوار ہوتا ہے پھر اس پر دوام کی امید نہیں، اور تعلق مع اللہ کے ساتھ منازعت نفس ختم ہو جاتی ہے اور دوام عمل کی امید غالب، قریب بہ یقین ہو جاتی ہے“

توحید کی برکت کی گود میں اطمینان ہوتا ہے، بچہ ماں کی

گود میں جا کر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے کہ بس اب کسی کا خوف نہیں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے معنی ”حضرت مولانا گنگوہی“

کا ارشاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع یہ ہے کہ جو افعال و صفات آپ کے اصلی دائمی ہوں کہ زیادہ غلبہ اور ظہور پانہی کا ہوا اور جو صفات و افعال حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے عارضی ہوں وہ تمہارے اندر بھی عارضی ہوں!!“

پنج گنج اشرف خصائلِ رذیلہ کو دور کرنے کے چند نسخے لکھے جا چکے، آخر میں حکیم الامت کی پانچ انمول ہدایتیں لکھی جاتی ہیں، ان پر نظر اور عمل ہو گا انشاء اللہ تعالیٰ روحانی صحت بھی بگڑنے نہ پائے گی، بلکہ دن بدن اس میں ایک بے پناہ قوت و طاقت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ ارشاد ہے :-

(۱) حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حب شیخ مفتاح سعادت ہے۔

(۲) عمر بھر اس کی ضرورت ہے کہ اپنے نفس کی نگہداشت رکھے،

اور علاج میں لگا رہے۔ کا طین بھی اس سے فارغ نہیں۔ صرف ضعف

و قوت کا فرق ہے نہ یا اس ہونا چاہیے نہ فرار

(۳) استقامت علی الاعمال خود ایک رفیع حالت ہے جو سب

کیفیات سے راجح ہے!

(۴) ثمرات پر نظر کرنا سبب ہے پریشانی کا!

(۵) انسان صرف مکلف اس کا ہے کہ اخلاق و ذیلہ کے مقتضیات پر عمل نہ کرے، رہا یہ کہ اقتضا آت ہی ناکمل یا ضعیف ہو جائیں اس کا انسان نہ مکلف ہے نہ یہہ لبہولت میسر ہو سکتا ہے۔
 بسیار سفر با یدتا پختہ شود و خاے!

★

اب دعا ہے کہ :

اے ارحم الراحمین اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ کے اس رہبر مشفق کو اپنی رحمت خاصہ کے آغوش میں سکون نصیب فرما اور اس کو اپنی خوشنودی و رضا سے شاد و کام فرما، اس کے آثار و نقوش کو عموماً و دوام عطا فرما۔ اے بارے الہا! اس مولف حقیر اور ناشر البیق کو اور کترین کاتب کتاب ہند کو خصوصاً اور اپنے بندہ اشرف کے تمام حبین و معتقدین کو خصوصاً اور سارے مسلمانوں کو عموماً اتباع سنت مقدسہ اور استقامت دین حنیف کی توفیق بخش اور حسن خاتمہ کی دولت لاندہ وال ان کے لئے مقدر فرما

ندائیم غیر از تو فریادیں
 توئی عاصیاں را خطا بخش و پس

آمین بحمتک یا ارحم الراحمین۔ صلی اللہ تعالیٰ
 علی محمد نبی الہی و علی الہ و اصحابہ اجمعین۔

—————

